جوش ملیح آبادی
اور
فراق گورکھپوری

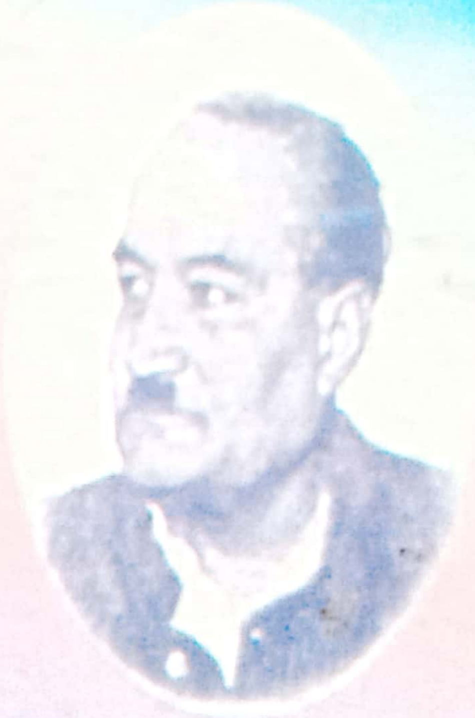

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

Scanned with CamScanner

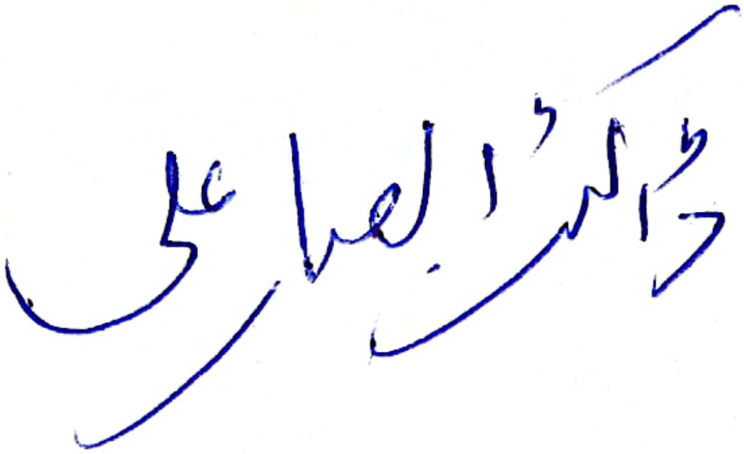

Scanned with CamScanner

وش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

الوقار پبلی کیشنز

335-K2 Wapda Town, Lahore.

E-mail: alwaqarpublications@hotmail.com

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

الوقار پبلی کیشنز

335-K2 Wapda Town, Lahore.

E-mail: alwaqarpublications@hotmail.com

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : سید وقار معین

0300-8408750
042-5189691-92

سالِ اشاعت : 2006ء

طابع : گنج شکر پریس، لاہور۔

قیمت : -/350 روپے

الوقار پبلی کیشنز
335-K2 Wapda Town, Lahore.
E-mail: alwaqarpublications@hotmail.com

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر اطہر علی

بیادِ

ممتاز ادیب و شاعر

مشفق خواجہ (مرحوم)

Scanned with CamScanner

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
	انتساب	
	کتاب سے پہلے	
۱۔	جوش انقلابی سوچ کے حوالے سے	۱۱
۲۔	جوش کی غزل گوئی	۳۴
۳۔	جوش رُباعیات کی روشنی میں	۴۲
۴۔	جوش ملیح آبادی اور نیاز و نگار	۵۲
۵۔	بین المملکتی مشاعرہ اور کراچی میں جوش کی پہلی آمد	۵۸
	ضمیمہ نمبر ا	۶۸
	ضمیمہ نمبر ۲	۷۰
۶۔	جوش ملیح آبادی مختصر سوانحی کوائف	۷۷
۷۔	میری پسند پانچ نظمیں	۸۳
	ا۔ شمع ہدایت	۸۴
	۲۔ جنگل کی شہزادی	۸۷
	۳۔ تلاشی	۹۲
	۴۔ ماتم آزادی	۹۳
	۵۔ گل بدنی	۱۰۴

Scanned with CamScanner

صفحہ نمبر	فہرست مضامین	نمبر شمار
۱۱۱	فراق گورکھپوری کی غزل، ایک نیا رنگ و آہنگ	۱۔
۱۳۳	فراق گورکھپوری بحیثیت رُباعی نگار	۲۔
۱۴۱	فراق گورکھپوری اور نیاز ونگار	۳۔
۱۵۵	فراق گورکھپوری سے سلسلۂ ملاقات و مراسلت	۴۔
۱٦۷	فراق گورکھپوری، مختصر سوانحی کوائف	۵۔
۱٦۹	فراق کے شعری مجموعے جو میری نظر سے گزرے	٦۔
۱۷۴	میری پسند	۷۔
۱۷۵	غزلیات	
۱۸۵	منظومات	
۱۹۹	رُباعیات	
۲۰۸	متفرقات	

Scanned with CamScanner

کتاب سے پہلے

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کو میں نے ایک ساتھ اور ایک ہی کتاب میں موضوع گفتگو کیوں بنایا؟ اس کے لئے کسی سنجیدہ یا منطقی جواب فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کو علم ہے کہ دونوں ہم عصر و ہم عمر تھے۔ دونوں نے اردو ادب کی تاریخ کو مالا مال کیا ہے اور علامہ اقبال کے دوش بدوش بیسویں صدی کا اُردو اُدب عموماً انہیں دونوں کے نام سے نہ صرف زندہ و پائندہ ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ ان ہی دونوں کی فکر و فن کے تعلق سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک نے جدید نظم کے حوالے سے اور ایک نے جدید غزل کے حوالے سے اُردو شاعری کو اتنا متمول کر دیا ہے کہ اُردو شاعری، گرد و پیش کے ماحول اور مقامیت کی حدود سے نکل کر آفاقی فضا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جوشؔ و فراقؔ دونوں میں ہم عصری اور ہم عمری کے علاوہ بھی کئی پہلو باہم مشترک ہیں۔ دونوں اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کی نویں دہائی میں وفات پائی۔ شاعری کے ساتھ دونوں نے اُردو نثر کی طرف اپنی توجہ صرف کی، چنانچہ ''اشارت'' سے لے کر ''یادوں کی بارات'' تک جوش نے اُردو نثر کو ایسا خوبصورت و دل نشیں پیرایۂ اظہار دے دیا ہے کہ اُن کتابوں کے مواد کے بعض اجزاء سے اختلاف کے باوجود اُن کے سادہ و پُرکار اُسلوب کی داد ہر صاحبِ ذوق کو دینی پڑتی ہے۔ فراق کی بھی یہی صورت ہے کہ اُنہوں نے اُردو نثر کو اپنی تنقید کے ذریعے فکر انگیز اور مدلل پیرایۂ بیان دے کر اُردو کی تنقیدی نثر کو حد درجہ باوقار اور باوقعت بنا دیا ہے۔ چنانچہ ''اندازے'' فراق کے محض تنقیدی مضامین کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ کلاسیکی اُردو شاعری اور شعر سے متعلق کلاسیکی شخصیات کو زندۂ جاوید بنا دینے کا عمل بھی ہے۔ ہاں دونوں کے زبان و بیان اور فکرِ سخن میں ایک نمایاں فرق یہ ضرور ہے کہ جوشؔ نے عموماً عربی و فارسی سے اور فراقؔ نے بیشتر ہندی و سنسکرت سے استفادہ کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں بڑے شاعروں کی زندگی و شخصیت میں کچھ ایسی باہم مماثلتیں بھی تھیں کہ ہم عصر اور ہم عمر اور اہم مرتبہ شاعروں میں شاذ ہوتی ہیں بلکہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ دو ہمعصر و معاصر ایک دوسرے کی ضد کے طور پر یا حریف و مد مقابل بن کر سامنے آتے ہیں، لیکن جوش اور فراق کا معاملہ الگ تھا۔ نجی محفل ہو یا مختصر شعری نشست، بڑا عوامی مشاعرہ ہو یا منتخب افراد پر مشتمل مجلس شعر و سخن، دونوں خوش دلی کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ لے کر شریک ہوتے تھے۔ اُن کی ہم عصری کی عام صورت یہ تھی کہ دونوں اپنے عہد کے قد آور اور مقبول عام شاعر تو تھے ہی، جسامت و قامت یعنی جسمانی ڈیل ڈول میں بھی بہت ملتے جلتے تھے۔ دونوں بلانوش تھے اور دونوں کے ذوق و شوق اور عادات و اطوار بھی تقریباً ایک جیسے تھے۔ دونوں کی آواز گرجدار تھی، دونوں ہمیشہ تحت اللفظ شعر پڑھتے تھے اور سامعین سے توقع رکھتے تھے کہ پہلے وہ اُن کے سنائے ہوئے شعر کے پہلے مصرعے کو اُٹھائیں گے۔ پھر وہ دوسرا مصرعہ سنائیں گے۔ جوشؔ صاحب اس معاملے میں کچھ زیادہ سخت گیر تھے اور سامعین سے مصرعہ اُٹھوائے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ کسی طرف سے فرمائش موجود ہو تو الگ بات ہے ورنہ دونوں رباعیوں سے شعر سنانے کا آغاز کرتے تھے۔ مشاعروں میں ہمیشہ شیروانی میں ملبوس ہوتے تھے، مشاعرے کے اسٹیج پر کوئی اور مشغلہ قابلِ عمل نظر نہ آتا تو ایک سگریٹ نوشی میں اور دوسرا پان نوشی میں مشغول رہتا تھا۔ ویسے فرصت کے اوقات اور بے تکلف احباب کی محفلوں میں دونوں کی عادات و اطوار تقریباً ایک جیسے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے رہتے تھے اور مجلس کو زعفران بنائے رکھتے تھے۔

فکر و فن اور زبان و بیان کے ان مشترک حوالوں اور یکساں پہلوؤں سے قطع نظر میں اپنے ذاتی تعلق کی بناء پر بھی کہہ سکتا ہوں کہ جوش اور فراق دونوں سے میں بوجوہ یکساں متاثر رہا ہوں۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی برسوں میں مجھے دونوں سے ایک ساتھ ملنے کا موقع ملا ہے، دونوں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، کئی بار مشاعروں میں ان کو ایک ساتھ پڑھتے سنا ہے، مسلم ہائی اسکول فتح پور کے سالانہ مشاعروں ہی میں نہیں، لکھنؤ، کانپور اور الہٰ آباد کے بعض

دوسرے مشاعروں میں بھی اور یہ اُسی زمانے کی ذاتی رسم وراہ کا اثر ہی تو تھا کہ میں نے مارچ ۱۹۵۲ء میں دونوں کو ایک ساتھ کراچی کے ایک بین المملکتی مشاعرے میں بلا لیا اور اُن کی آمد کراچی میں میری توقیر و اعزاز بڑھانے کا وسیلہ بن گئی پھر اُن دونوں سے میری نیاز مندی اُن کی آخری سانسوں تک باقی رہی۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نے ایک ہی سال میں یعنی ۱۹۸۲ء میں وفات پائی۔ پہلے جوش گئے پھر دس دن بعد فراق نے بھی رختِ سفر باندھا، میں دونوں کے بارے میں کسی نہ کسی بہانے سے جو کچھ لکھ سکتا تھا لکھتا رہا۔ زیرِ نظر کتاب حقیقتاً ان ہی دونوں کی یادوں سے وابستہ ہے اور دو حصّوں میں تقسیم ہے۔

پہلا حصّہ جوشؔ ملیح آبادی کے فکر و فن سے متعلق ہے اور دوسرے حصّے کا تعلق فراقؔ گورکھپوری کی شخصیت و شاعری سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوشؔ اور فراقؔ کو ساتھ ساتھ پڑھنے میں زیادہ لطف آئے گا اور قاری کے ذہن میں بیسویں صدی کے ادب کے بعض ایسے دریچے آسانی سے وا ہو سکیں گے جو شاید ان کو الگ الگ پڑھنے سے نہ ہوتے۔

میری تحریروں اور زیرِ نظر کتاب کا یہی مقصد و منشا تھا، اگر یہ مقصد و منشاء جزوی طور پر بھی حاصل ہو گیا تو میں اپنی کاوش کو کارگر جانوں گا۔

اس کتاب کی تیاری اور تکمیل میں برادرم محمد اصغر کاظمی اور ارشد محمود نے جس طرح میری مدد کی ہے۔ اس کیلئے رسمی شکریے کے الفاظ مناسب نہیں، دونوں عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور میرے اپنے بچوں کی طرح ہیں، اسلئے ان کی درازی عمر اور روشن مستقبل کیلئے دل سے نکلی ہوئی دعائیں ان کو دے رہا ہوں۔

فرمان فتح پوری

Scanned with CamScanner

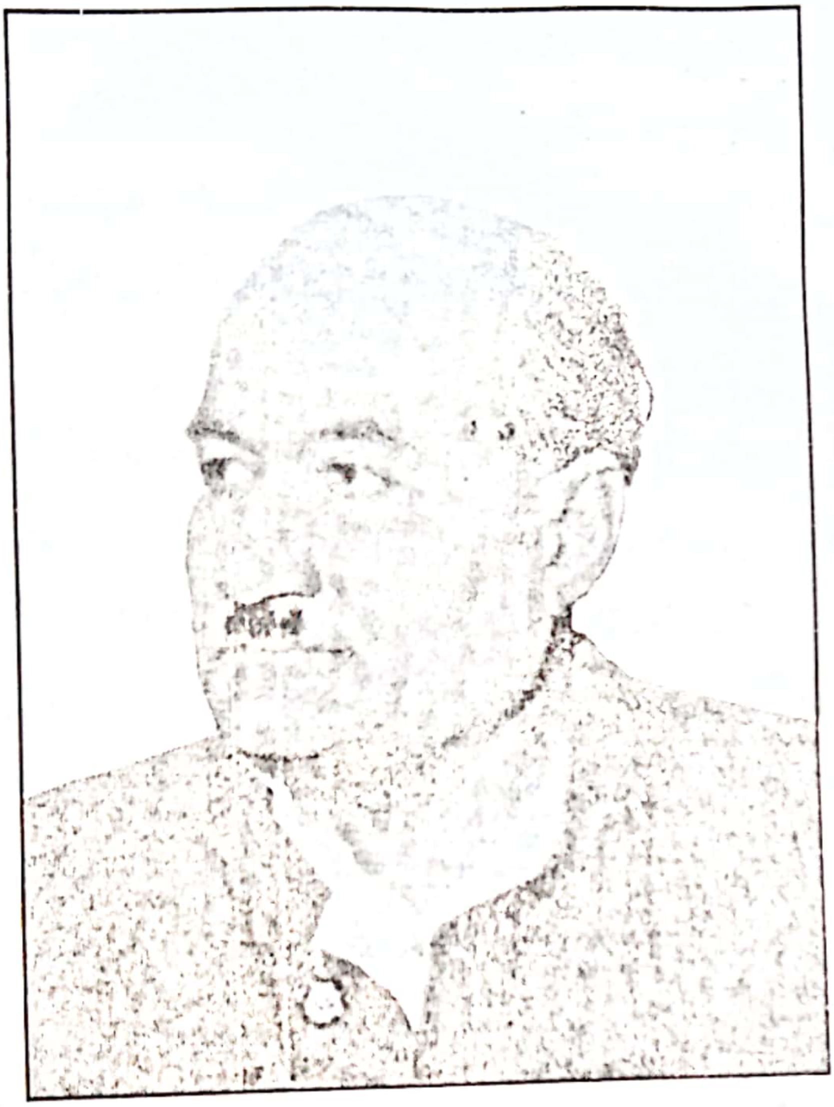

جوشؔ ملیح آبادی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جوش ملیح آبادی انقلابی سوچ کے حوالے سے

ادب کی تاریخ میں عموماً دو قسم کے شاعر نظر آتے ہیں۔ایک وہ جو کسی خاص زبان کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی وجہ سے زبانیں پہچانی جاتی ہیں۔ یہ دوسرے قسم کے شاعر زبان کے تابع نہیں بلکہ زبان کے محسن ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے لسانی عطیات سے زبان کی توسیع و توقیر بڑھانے میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے دیئے ہوئے الفاظ و محاورات اور تراکیب و استعارات کی بدولت زبان کا قامت و وقار بڑھ جاتا ہے۔نوع بہ نوع اسالیب، تازہ بتازہ خیالات و افکار ہاتھ آتے ہیں اور ذہنِ انسانی کو اپنے اظہار کیلئے نئے نئے لہجے اور وسیلے مل جاتے ہیں۔

اردو میں نظیر اکبر آبادی، غالب، میر انیس، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی اسی قبیل کے شاعر ہیں، یہ لوگ صرف یہی نہیں کہ اردو کے عظیم شاعر ہیں بلکہ یہ اردو کے مربی و محسن بھی ہیں۔ان کی بدولت خصوصاً بیسویں صدی میں اقبال کی شعری و نثری تحریروں کی بدولت اردو میں ایسی وسعت و گیرائی پیدا ہوگئی ہے کہ اب اس میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل و مضامین کا اظہار بھی چنداں مشکل نہیں رہا،لیکن مجھے اس جگہ اقبال کے بارے میں نہیں بلکہ جوش کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور وہ بھی ان کے لسانی عطیات و خدمات کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کے شاعرانہ کمالات و امتیازات کے ان حوالوں سے جو ان کے انقلابی سوچ کی نشان دہی کرتے ہوں۔

سب جانتے ہیں کہ جوش کی شاعری یک رخی نہیں بہت پہلو دار ہے، رنگا رنگ اور ہمہ گیر ہے، بہ اعتبارِ ہیئت و صنف سخن بھی اور بلحاظ موضوع و مواد بھی، چنانچہ کسی مختصر سی گفتگو یا مضمون میں ان کی پوری شاعری کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ہاں کسی ایک پہلو پر اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے چنانچہ اس جگہ جوش کی صرف انقلابی شاعری اور ان کی انقلابی سوچ کے حوالے سے کچھ عرض کیا جائے گا۔

جوشؔ نے جس فضا میں شعور کی آنکھ کھولی اور اپنی شاعری کا آغاز کیا اس میں اقبالؔ کے

Scanned with CamScanner

علاوہ متعدد بڑے شاعروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔میری مراد، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری اور جگر مراد آبادی، وغیرہ کی آوازوں سے ہے لیکن جوش کیلئے ان میں سے کسی نے بھی کوئی الجھن پیدا نہیں کی۔سبب یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک بحیثیت مجموعی، داخلیت پسند اور دروں بیں تھا اور سب کا جھکاؤ شاعری میں غزل کی طرف تھا جبکہ جوش اپنی طبعی داخلیت پسندی کے باوجود خارجی حالات سے نظریں ملا کر چلنا چاہتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ انہیں غزل کے بجائے نظم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ایسے میں اگر کوئی شاعر، جوش کی توجہ کا مرکز، یا ان کا پسندیدہ شاعر یا ان کیلئے کوئی مسئلہ ہوسکتا تھا وہ صرف علامہ اقبال تھے۔

توجہ اور پسندیدگی کا ایک واضح ثبوت تو یہی ہے کہ جوش نے اقبال سے یک گونہ ذہنی مناسبت کے سبب، ان کو اپنا ہمدرد جانا اور حیدر آباد جاتے وقت تعارف و ملازمت کیلئے علامہ اقبال سے سفارشی خط لکھوایا۔شاعری میں اگر جوش نے علامہ کی طرح غزلیں بھی کہیں اور آخر عمر تک کہیں لیکن مجموعی توجہ دونوں کی نظم کی طرف رہی اور دونوں کے موضوع گفتگو کا رخ، ملک وقوم کے سیاسی وسماجی حالات ہی کی طرف رہا چنانچہ دونوں کی وجہ شناخت اور نشان امتیاز غزلیں نہیں نظمیں ہیں۔اس مطابقت ومماثلت کے باوجود علامہ اقبال اور ان کی شاعرانہ لے جوش کیلئے بہرحال ایک مسئلہ تھی۔

مسئلہ ہونے کا سبب تھا۔۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان جس وقت خوش نے میدان سخن میں قدم رکھا اس وقت اقبال کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔اقبال کی مشہور نظمیں، شکوہ جواب شکوہ، طلوع اسلام، ہمالہ، تصویر درد، شمع و شاعر اور خضر راہ وغیرہ شائع ہوچکی تھیں۔شعری مجموعون میں فارسی کے تین مجموعے ''اسرار خودی''، ''رموز بیخودی'' اور ''پیام مشرق'' اور اردو کا ایک مجموعہ ''بانگ درا'' منظر عام پر آچکا تھا۔بحیثیت نظم نگار ملک کے اندر اور باہر علامہ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ برصغیر پاک وہند کے شعراء کیلئے وہ برگد کے درخت بنے ہوئے

تھے۔اس کے سائے میں کسی نظم نگار شاعر کا ابھرنا، اپنے لئے کوئی امتیازی نشان بنانا، علامہ اقبال سے الگ اپنے لئے کوئی نئی راہ نکالنا اور خود کو نظم کا ایک بڑا شاعر منوالینا آسان نہ تھا، لیکن جوش نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور لسانی حذاقت کی بدولت ایسا کر دکھایا۔

علامہ اقبالؔ اور ان کی شاعری کو جوش کیلئے میں نے مسئلہ یوں بھی قرار دیا ہے کہ جوش طبعاً اقبال کی شعری نہج کو بہت پسند کرتے تھے۔ انقلابی مزاج رکھنے کے سبب خود کو اقبال کے فلسفہ حیات و پیغام سے قریب تر محسوس کرتے تھے اور اسی کے ساتھ وہ اقبال کے متوازی یا مساوی اپنی شاعری کا ایک الگ پرچم بھی بلند رکھنا چاہتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ جوش کو فکر و فلسفہ اور مغربی علوم وفنون کا وہ عمیق و بسیط علم وادراک میسر نہ تھا جو اقبال کے پاس تھا۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کہ جوش بھی اقبال ہی کی طرح حساس طبیعت اور مفکرانہ ذہن رکھتے تھے۔ ملک وقوم کی سیاسی وسماجی زبوں حالی پر کڑھتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے میں خاص قسم کی تبدیلیاں دیکھنے کے متمنی تھے۔ رہ گئی قادر الکلامی، سو، اس میں دونوں کو یکساں کمال حاصل تھا دونوں عربی وفارسی کی روایات اور ان کے اسالیب و ذخیرہ الفاظ سے استفادہ کر رہے تھے، چنانچہ جوش و اقبال دونوں نے اپنے مجموعہ ہائے کلام کیلئے عربی وفارسی کے دو لفظی مرکبات کا استعمال کیا ہے۔

اقبال نے اپنے شعری مجموعوں مثلاً ''اسرارِ خودی''، ''رموز بیخودی''، ''بانگِ درا''، ''پیامِ مشرق'' اور ''بالِ جبریل'' وغیرہ کیلئے عربی وفارسی لفظوں کے جو مرکبات استعمال کئے انہیں قواعد کی زبان میں مرکب اضافی کہا جائے گا، اس لئے کہ یہ فارسی کی علامت اضافت کے ساتھ مرکب کئے گئے ہیں۔ جبکہ جوش ملیح آبادی کے کلام کے مجموعے مثلاً ''شعلہ و شبنم''، ''سنبل و سلاسل''، ''جنون و حکمت''، ''نقش و نگار''، ''عرش وفرش'' اور ''نجوم و جواہر'' وغیرہ کو مرکبات عطفی کا نام دیا جائے گا یہ حرفِ عطف ''واؤ'' کی مدد سے ترکیب دیئے گئے ہیں۔ بظاہر دونوں قسم کے مرکبات ایک جیسے ہیں لیکن اس یکسانی کے باوجود، دونوں میں خاص فرق ہے اور فرق یہ ہے کہ اقبال کے مرکبات، ایجاز و اختصار کی طرف اور جوش کے مرکبات طوالت و اطناب کی طرف اشارہ

Scanned with CamScanner

کرتے ہیں اور یہ اشارہ اقبال و جوش کے اندازِ بیان کی طرف بھی ایک بلیغ اشارہ ہے۔ محض شعری مجموعوں کے ناموں سے سراغ مل جاتا ہے کہ علامہ اقبال جو کام، دو کلمات سے نکال لیتے ہیں جوش کو اس کے لئے تین کلموں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اردو کو جوش اور اقبال نے الفاظ کا بڑا ذخیرہ دیا ہے۔ اس ذخیرے میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے، علامہ کے دیئے ہوئے الفاظ و مرکبات کا تعلق بیشتر عربی و فارسی کے نئے الفاظ سے ہے جبکہ جوش نے عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی الفاظ بھی بکثرت دیئے ہیں۔ رہ گئی اشعار کی تعداد، سو، اس کا شمار تو میں نے نہیں کیا لیکن بات بہت واضح ہے کہ اقبال اور جوش کے ہم عصر و ہم عمر شعراء میں سے کسی نے بھی اردو کو اتنا بڑا ذخیرۂ الفاظ نہیں دیا جتنا جوش و اقبال نے دیا ہے۔

اقبال کو عرفِ عام میں شاعرِ مشرق اور جوش کو شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے لیکن بعض حضرات، جوش کو شاعرِ انقلاب تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ جوش کے پاس انقلاب کا کوئی مربوط فلسفیانہ تصور نہیں ہے، وہ صرف رومانی تصورات ہی کو انقلاب سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی شاعر کے انقلابی ذہن کو اس طرح جانچنا پرکھنا درست نہیں ہے۔ غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ رومانی مزاج ہی دراصل انقلابی مزاج کا حامل ہوتا ہے چنانچہ کسی شاعر کو شاعرِ انقلاب، صرف ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ زندگی کے جن نازک مسائل و موضوعات کو ہاتھ لگاتے ہوئے دوسرے شعراء ڈرتے اور ہچکچاتے ہیں وہ انہیں بے باکانہ و جرأت رندانہ کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ جوش نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے اپنے شاعری کے ابتدائی زمانے ہی میں دوسرے ہمعصر شعراء کے برعکس، مذہبی تنگ نظری، اجارہ داری اور بے بصری کے خلاف آواز اٹھائی اور خطرناک سے خطرناک موضوعات کو اپنا کر ''میرا نعرا انقلاب و انقلاب و انقلاب'' کا ایک ایسا غلغلہ بلند کیا کہ اردو کے ایوان شاعری میں واقعی ایک بھونچال سا آ گیا۔ عام و خاص سب ان کی طرف لپکے اور وہ اپنے بے باک روّیے اور بے باک اظہارِ خیال کی بدولت اپنی زندگی ہی میں اقبال کے بعد اردو کے مقبول ترین شاعر بن گئے۔

Scanned with CamScanner

مذہبی تنگ نظری وتوہم پرستی کے خلاف جوش کی ان بے باک نظموں سے قطع نظر جو مذہبی حلقوں کی طرف سے ان کی مخالفت کا باعث ہوئیں، جوش نے زندگی کے دوسرے سیاسی و سماجی شعبوں میں بھی اسی قسم کی حریت فکر اور جراتِ اظہار کا ثبوت دیا ہے۔ ریاست حیدر آباد سے نکالے جانے کا واقعہ تو سب ہی کے علم میں ہے، اس لئے کہ اوروں کے علاوہ خود جوش نے ''یادوں کی بارات'' میں اس کی داستان بیان کر دی ہے۔ جوش ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان کم وبیش دس سال حیدر آباد دکن میں رہے لیکن ان کا باغی ذہن وہاں کے ریاستی ماحول سے کبھی مطابقت پیدا نہ کر سکا۔ وہ اسے موقع بہ موقع طنز وتضحیک کا نشانہ بناتے رہے۔ آخر کار وہاں سے نکالے گئے۔ کس بات پر؟ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ اردو شعراء کی عالم روش کے برعکس نظام کی شان میں قصیدہ لکھنے پر رضامند نہ ہوئے۔

مخالفین نے دربار تک خبر پہنچائی۔ ایک رسالے نے جوش کی ایک بہاریہ نظم شائع کی۔ نظم کا آخری شعر یوں تھا:

کبھی جوش کی جوش سے مدح فرما
کبھی گل رخوں کی ثناء خوانیاں کر

اس شعر کے حوالے سے نظام کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ نظم، ان کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی ہے اور اس میں دربار کا مذاق اڑایا گیا ہے، اس کے کچھ دنوں بعد جوش نے ''غلط بخشی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور غضب یہ کیا کہ اسے جاگیرداروں، وظیفہ خواروں، وزیروں اور درباریوں کی محفل میں سنا دیا، نتیجتاً ریاست بدری کا فرمان جاری ہوگیا۔ جوش کے بہی خواہوں نے بہت چاہا کہ وہ معافی مانگ لیں اور حیدر آباد کی خوشگوار زندگی اور اچھی بھلی روزی کو لات نہ ماریں لیکن جوش معافی مانگنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ سب جانتے ہیں کہ نظام حیدر آباد کے خلاف زبان کھولنا یا ان کی شان کے خلاف کنایتہً واشارۃً بھی کچھ کہنا، ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی لیکن جوش نے ایسا کر دکھایا۔ ان کا یہ اقدام رومانی نہیں انقلابی تھا اور ان کے اسی اقدام نے بعد کے اردو شعراء کو وہ

Scanned with CamScanner

حوصلہ عطا کیا جس نے جاگیردارانہ طرزِ زندگی، عیاشانہ معاشرت، ظالمانہ نظامِ معیشت اور استحصالی و جبری زرعی نظام کو بہت جلد کھلم کھلا اپنے طنز و تضحیک کا نشانہ بنالیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جوش نے حیدرآباد سے شہر بدر ہونے پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا بلکہ معافی تلافی کی کوشش کے ساتھ تحریری معذرت نامے بھی پیش کیئے تھے۔ بعض اہلِ قلم نے جوش کی زندگی کے اس پہلو کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور جوش نے ''یادوں کی بارات'' میں اپنی خود داری و بے باکی کی جو داستان بیان کی ہے اسے غلط بتایا ہے۔ میں اس کی تردید یا تائید میں نہیں جاتا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ جوش کی پوری شاعری اور روشِ زندگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ طبعاً حریت پسند مزاج، آزادانہ طبیعت اور باغیانہ ذہن رکھتے تھے۔ ہندوستان کے غلامانہ اور ریاست حیدرآباد کے خوشامدانہ ماحول میں وہ بھی دوسروں کی طرح جی رہے تھے لیکن سیاسی و سماجی فضا کی کربناکی کے احساس کے ساتھ۔ جوانی سے لے کر آخری عمر تک انہوں نے ایک طرح کی گھٹن محسوس کی اور جب کبھی انہیں موقع ملا ہزار بندشوں کے باوجود کسی نہ کسی پیرائے میں، اس گھٹن کا اظہار کیا۔

یوں بھی کسی بڑے شاعر یا ادیب کے ذہن کو پرکھنے اور اس کے کردار کے بارے میں اس کی زندگی کے ایک آدھ واقعے کو سامنے رکھ کر، کسی قسم کا حکم لگانے کا طریقہ کار درست نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ بحیثیت مجموعی شاعر کا اندازِ زیست کیا رہا ہے اور عام معاشرتی زندگی میں اس کے فکر و عمل نے کیا رخ اختیار کیا ہے۔

جوش اور علامہ کی پوری شاعری اس امر کی شاہد ہے کہ یہ دونوں عمر بھر ہندوستان کی غلامی اور ہندوستانیوں کی معاشی اور سیاسی زبوں حالی پر کڑھتے رہے اور ذہنی طور پر کبھی جبر و ظلم کی قوتوں کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکے۔ اس لئے کسی معاشی و سماجی مجبوری کے تحت علامہ اقبال کا، نواب بھوپال یا حیدرآباد کے مہاراجہ کشن پرشاد کو خطوط لکھنا یا ان کی خدمت میں چند توصیفی

قطعات و منظومات پیش کر دینا یا برطانوی سامراج کی طرف سے ''سر'' کا خطاب قبول کر لینا، اس بات پر ہرگز دلالت نہیں کرتا کہ علامہ اقبال خوشامد پسند یا سامراجیوں کے مداح تھے۔ اقبال کا سارا کلام اس بات کا گواہ ہے کہ وہ مغرب کی جابرانہ روش اور ان کے جارحانہ رویوں سے کبھی مفاہمت نہیں کر سکے۔ بلکہ عمر بھر انہیں طنز و تنقید کا نشانہ بنائے رکھا چنانچہ کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ

''سرکار کے دربار میں سر ہو گئے اقبال''

کوئی باشعور آدمی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اقبال فی الواقع خوشامدانہ ذہن کے مالک تھے یا ''سر'' کا خطاب پانے کے بعد ان کے انداز فکر میں کوئی تبدیلی آ گئی تھی۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، بلکہ سب جانتے ہیں اور سب کا یقین ہے کہ علامہ اقبال ملک و قوم کیلئے ایک دردمند دل لے کر آئے تھے اور اس دردمندی کا اظہار وہ آخری سانس تک کرتے رہے ہیں۔ اگر کسی شاعر یا ادیب کی رومانی و انقلابی سوچ کو اس پیمانے سے جانچا گیا اور اسے آدمی کے بجائے فرشتہ قرار دے کر مطعون کیا گیا تو پھر اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کو، اردو کا پہلا مفکر اور تجدد پسند اور باغی ذہن کا شاعر کہنے کے بجائے، پرلے درجے کا دقیانوس، بودا اور خوشامدی کہنا پڑے گا۔ اس لیئے کہ غالب نے کبھی کبھی معاشی مجبوریوں کے تحت صرف یہی نہیں کہ نواب رام پور اور متمول دوستوں کو خطوط لکھے بلکہ نوابوں، بادشاہوں اور برطانوی گورنر جرنلوں کے قصیدے بھی لکھے لیکن سب جانتے ہیں کہ غالب نے یہ سب کچھ خوش دلی سے نہیں کیا بے دلی اور ''مرتا کیا نہ کرتا'' کہ تحت کیا ہے، بالکل یہی صورت علامہ اقبال اور جوش کی ہے، ان کا باغیانہ ذہن اگرچہ غلامی اور مجبوری کی زنجیروں کا شکار رہا لیکن ان زنجیروں کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوششوں سے غالب باز نہیں رہے، ان کے اندر، بغاوت کی آگ عمر بھر ان زنجیروں کو گرمانے اور پگھلانے میں لگی رہی۔

کسی تخلیقی ذہن کو رومانی اور انقلابی کہنے کے سلسلے میں بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ مجھے تو جوش کی حوالے سے صرف یہ کہنا تھا کہ ان کے رومانی تصورات شروع ہی سے انقلابی سوچ کے حامل تھے اور وہ اپنے عہد کے ناہموار اور عوام کش سیاسی و سماجی حالات اور طرز حیات سے

ہمیشہ بیزار اور مکدر رہے چنانچہ مذہب کے نام پر لکھنو کی پُرتصنع اور زندگی کو مفلوج کر دینے والی عزادارانہ فضا سے لے کر، حیدرآباد کے درباردارانہ ماحول تک، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، آزادی کے بعد، ہندوستان و پاکستان کی گندم نما جوفروش جمہوریت تک، وہ سب نامطمئن اور سب کے نکتہ چین رہے ہیں اس لئے یہ بات صرف یہیں تک نہیں ہے بلکہ جوش کا ذہن، نظام حیدرآباد اور ان کے الطاف کریمانہ کے خلاف، بغاوت پر آمادہ ہوا بلکہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جبکہ ہمارے سیاسی زعما بھی برطانوی سامراج کی امداد و ہم نوائی پر مجبور تھے، جوش پہلے اور تنہا بڑے شاعر تھے، جنہوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف آواز بلند کی تھی اور اس کی سزا پائی تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں جب برطانوی سامراج اور اس کے اتحادیوں پر ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے تابڑ توڑ فضائی حملے کئے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریز حاکموں اور فوجیوں کا کیا حال تھا، یہ تو میری عمر کے سب لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ لندن کا بکنگھم پیلس تک گولہ باری کی زد میں آ گیا تھا۔ انگریز سپاہی، ہٹلر کے نام سے سوتے سے چونک اٹھتے تھے اور مارے خوف کے دوسری منزلوں کی چھت سے گر کر فرش پر آ رہتے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما اگرچہ برطانوی حکومت سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اور بظاہر انگریزوں سے متنفر تھے پھر بھی طوعاً و کرہاً سب حکومت کی مدد کر رہے تھے، کسی میں حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس خوفزدہ ماحول میں برطانوی سامراج کے خلاف اگر کسی کی آواز سنائی دی تو وہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی آواز تھی۔ جوش نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' کے عنوان سے انگریزوں کے خلاف ایک تاریخی نظم لکھی جو چند ہی روز میں زبان زد خلائق ہوگئی۔ یہ نظم نیچے درج کی جا رہی ہے۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پے امن و بقا
باغِ انسانی میں چلنے ہی کو ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

....

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر؟
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
جنتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

Scanned with CamScanner

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہوگی وہ میٹا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصرِ باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ؟
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
ڈائر گرگ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہل آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے

پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس میں کوڑوں کی صدا
آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
بینگی اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں؟
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے!
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟

Scanned with CamScanner

سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلا نہ لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؓ
خیر اے سوداگرو اب ہے تو، بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

دوسری جنگ عظیم کے اسی پرآشوب اور ہولناک زمانے میں جوش نے متعدد رباعیات اور قطعات بھی ایسے کہے تھے جن میں حکومت وقت کی مخالفت کی گئی تھی اور علاماتی و کنایاتی پیرائے میں حکمرانوں پر طنز کے تیر برسائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے، جوش کی ایک اور نظم اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی اور بیشتر نوجوانوں کو از بر تھی۔ اس میں برطانیہ، برطانیہ کے اتحادیوں اور برطانوی مقبوضات پر ہٹلر کے پے در پے حملوں خصوصاً لندن کے بکنگھم پیلس پر گولا گرانے کے واقعے کی داد دی گئی تھی، اس نظم کے دو شعر میرے ذہن میں ہنوز محفوظ ہیں۔

سلام اے ناخدائے جرمنی اے ہٹلرِ اعظم
سلام اے تاجدار روشنی اے نیر اعظم
بکنگھم کی خبر لینے، جو اس کے بعد پھر جانا
ہمارے نام سے بھی ایک گولا پھینکتے آنا

Scanned with CamScanner

عین جنگ کے زمانے میں ایک غلام ملک کے شاعر، جوش کا یہ روّیہ اور ان کی یہ نظمیں، جابر حکمرانوں کے خلاف اعلان بغاوت کی ایسی مثالیں ہیں جو ہمارے یہاں کمیاب نہیں نایاب ہیں۔ یہ ایسا روّیہ اور طرز سخن ہے جسے صرف شاعر کی انقلابی روح جنم دے سکتی ہے اور جس کے معنوی رخ کو دعوتِ بغاوت اور انقلاب کے سواء کسی اور چیز سے تعبیر ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جوش کے اس باغیانہ مزاج اور انقلابی رجحان کی کارفرمائی ان کے کلام میں شروع سے ملتی ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں وہ ایسی ناہمواریاں دیکھتے ہیں جو سماجی وتہذیبی زندگی کیلئے مہلک ہوں یا عامتہ الناس کے حقوق کو غصب کرتی ہوں، وہ ان پر، وار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس کی ایک واضح مثال ان کی مشہور نظم ''ماتم آزادی'' ہے۔

یہ نظم جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے حصول آزادی کے بعد کہی گئی ہے اور ہندوستانی حکمرانوں کے خلاف، ہندوستان میں بیٹھ کر کہی گئی ہے۔ یہ وہ سنہرا موقع تھا کہ جوش بعض دوسرے شعراء کی طرح پنڈت نہرو کا قصیدہ اور جشن آزادی پر مدحیہ نظم بھی لکھ سکتے تھے لیکن آزادی کے بعد آزاد ہندوستان اور اس کے رہنماؤں سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوئیں تو جوش نے بالاعلان، حکومت وحکمراں دونوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اس میں ایسی سخت زبان اور لہجہ استعمال کیا جس کی ہمت، جوش کے سواء کوئی دوسرا شاعر مشکل سے کرسکتا تھا۔ اس وقت کے ہندوستانی حکمرانوں کو بھی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اس تنقیدی لہجے کو برداشت کیا ورنہ اگر ایسی کوئی نظم کسی اور نو آزاد ملک میں کہی جاتی تو شاید شاعر کو باغی قرار دے کر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ ذرا جوش کی مسدس نما نظم کے تین بند دیکھتے چلئے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کس گھن گرج اور رنگ وآہنگ کی نظم ہے:

اے ہم نشین فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
روداد جام بخشیِ پیر مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

Scanned with CamScanner

کیا کیا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

شاخیں ہوئیں دو نیم جو ٹھنڈی ہوا چلی
گم ہوگئی شمیم جو بادِ صبا چلی
انگریز نے وہ چال بہ جور و جفا چلی
برپا ہوئی بہار کے گھر میں چلا چلی

خونِ چمن بہار کے آتے ہی بہہ گیا
اترا جو طوق اور بھی دم گھٹ کے رہ گیا

دولت ملی تو اور بھی نادار ہوگئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہوگئے
اترا جو بار اور گراں بار ہوگئے
آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہوگئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں سنگ ہوگئی
پَو یوں پھٹی کہ صبحِ چمن دنگ ہوگئی

سلوں کے انجمن میں خریدار آگئے
سیٹھوں کے خادمانِ وفادار آگئے

Scanned with CamScanner

کھدر پہن پہن کے بداطوار آ گئے
در پہ سفید پوش سیہ کار آ گئے

تاریکیوں کو چھوڑ کر روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیرِ زمیں گئے

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی
چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی

رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی
گدی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

برطانیہ کے خاص غلامان خانہ زاد
دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حب وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب ہے اب تک سروں کو یاد
وہ آئی سی ایس ہیں آج بھی خوش وقت و بامراد

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے، کپتان بن گئے

Scanned with CamScanner

سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں، نہ جامِ جم، نہ جوانی نہ جوئے بار
گلشن، نہ گلبدن، نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

....

کم وبیش ڈیڑھ سواشعار پر مشتمل یہ نظم، جوش کے فکروفن کا شاہکار ہے، ان کی انقلابی سوچ کی غماز اور ترجمان ہے، نظم کیا ہے حقیقتاً، ایک قسم کا عوامی سیاسی رجز نامہ ہے، ایسا رجز نامہ جو کمزوروں اور مجبوروں کو، جابروں اور ارباب اقتدار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر اکساتا ہے۔ انہیں اپنے حقوق کے حصول کیلئے نبرد آزمائی پر آمادہ کرتا ہے، سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے، زر پرستارانہ نظام کے حواریوں کے سینوں میں نشتر چبھوتا ہے اور امارت پسندوں کے ایوانوں میں ایک طرح کا لرزہ پیدا کردیتا ہے۔

ہر چند کہ یہ نظم، ہندوستان کی سیاسی وسماجی اور انتظامی ابتری کے زیر اثر لکھی گئی ہے لیکن اس کا دائرہ اثر محدود و مقامی نہیں ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں ہندوستان سے مماثل و مشابہ حالات رونما ہوں گے وہاں کے باشعور اور بیدار ذہن لوگ، اس نظم کو اپنا ترجمان جانیں گے، اور اپنی احتجاجی وانقلابی تحریکوں میں بطور ہتھیار استعمال کریں گے۔ شاعری میں دراصل اسی طرز سخن سرائی کا نام انقلابی سوچ اور لہجہ ہے اور اسی سوچ اور اسی لہجے کے سبب کہنا پڑتا ہے کہ جوش محض رومانی نہیں بلکہ انقلابی سوچ کے شاعر بھی ہیں۔ ایسا ہونا محض شعوری نہیں طبعی امر ہے کہ رومانی ذہن ہی انقلاب کا بانی ہوا کرتا ہے۔ جو طبعاً رومانی نہیں وہ انقلابی بھی نہیں ہوسکتا۔ رومانی شاعر اپنی غیر

Scanned with CamScanner

معمولی قوت تخیل اور وفور جذبات کی بدولت اپنی شاعری میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے اور ایسے مسائل کو موضوع سخن بنالیتا ہے جنہیں ہاتھ لگاتے ہوئے دوسرے ہم عمر عموماً خوف کھاتے ہیں یا بہ دانستہ نظر انداز کر جاتے ہیں۔

جوش کی سوچ کی رومانی اور انقلابی روش، ان کے یہاں جوانی سے لے کر آخری عمر تک یکساں کارفرما رہی ہے۔ جوش جس وقت ہندوستان سے پاکستان آئے یہاں کے حالات جمہوری زاویہ نظر سے ہندوستان کے بالکل برعکس تھے، یعنی مارشل لاء کے تحت فوجی حکومت قائم تھی اور یہ پہلی مارشل لاء حکومت ایسی سخت گیر تھی کہ ادیب وشاعر تو درکنار کسی سیاسی اور عوامی لیڈر میں بھی چوں کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ایک ذوالفقار علی بھٹو البتہ عوامی لیڈر بن کر سامنے آئے لیکن چند ہی سال بعد دوسرا مارشل لاء آ گیا اور اس نے انہیں ہمیشہ کیلئے ٹھکانے لگا دیا۔ حق یہ ہے کہ عملاً سبھی اس مارشل لاء کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے تھے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں نے کسی مصلحت کی بناء پر، بعض نے اپنی خوئے تملق کی بناء پر کچھ نے طوعاً و کرہاً اس فوجی حکومت کی قصیدہ خوانی بھی شروع کر رکھی تھی۔ یہ تھی وہ فضا جس میں جوش، پاکستان آئے اور یہ ماحول، جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے۔ ظاہر ہے اس موسم میں خاموش رہنے کے سوا کسی انداز سے کچھ کہنے کی گنجائش یا زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی لیکن جوش ملیح آبادی نے پاکستان میں مارشل لاء کے بانی اور سب سے خوفناک مارشل لاء حکومت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب کو نصیحت فضیحت کرنے کی ایک سبیل نکال لی۔

ہوا یہ کہ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ولیکا سیمنٹ فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا جانا تھا اور اس کارخیر کے لئے صدر پاکستان محمد ایوب خان کو مدعو کیا گیا تھا...... جوش ملیح آبادی اور سبط بھائی (سبط حسن) کی بدولت جناب روشن علی بھیم جی کے توسط سے فیکٹری کے ارباب حل وعقد نے جوش سے اس موقع کیلئے ایک نظم کہنے اور جلسے میں پڑھنے کی درخواست کی۔ جوش نے دوسری درخواست تو قبول نہ کی البتہ نظم کہہ کر بھجوا دی۔ نظم کچھ ایسی خطرناک نہ تھی، پھر بھی اس نظم کو جلسے میں پڑھنے یا

Scanned with CamScanner

پڑھوانے کی ہمت کسی میں نہ ہوئی۔ بعد کو یہ نظم جوش نمبر (افکار کراچی) کے دوسرے ایڈیشن، میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بڑے اور خلاق شاعر کو جب اپنی مرضی اور افتاد طبع کے خلاف یا کسی سماجی واخلاقی مجبوری کے تحت کچھ کہنا ہی پڑتا ہے تو اپنے دل کی بات کہنے کیلئے کوئی نہ کوئی راستہ اور پیرایہ، بہر حال نکال لیتا ہے۔

جوش کی نظم میں پچاس کے قریب اشعار ہیں اور یہ اشعار معنوی اعتبار کے لحاظ سے تین چار حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ یہ قصیدہ نہیں بلکہ محمد ایوب خان کے نام ایک نصیحت نامہ ہے اور اس نصیحت نامے کے ابتدائی اشعار میں دنیا بھر کے جابروں اور قاہروں کے مظالم کے نتائج کی تصویر اس انداز سے کھینچی گئی ہے کہ جیسے وہ محمد ایوب خاں کو اپنے اعمال کا آئینہ دکھا رہی ہو۔ ذرا اس نظم کا صرف ابتدائی حصہ دیکھئے۔

اس زمیں پر موتیوں اور آنسوؤں کے درمیاں
مدتوں سے چل رہا ہے زندگی کا کارواں
کتنی صبحیں پل چکی ہیں گلشن آفاق میں
کتنی شامیں جل چکی ہیں روز و شب کے طاق میں
قیصر و اسفندیار و خسرو و بہرام و زار
کتنے تاجوں کی چمک دیکھے ہوئے ہے روزگار
کتنے ایوانوں کے آگے جھک چکی ہے زندگی
کتنے تخت اپنے سروں پر رکھ چکا ہے آدمی
ڈس چکا ہے کتنے داناؤں کو نادانوں کا تاؤ
پھونک کر بھڑکے ہیں کتنے سرخ آنکھوں کے الاؤ
عین مفتوحوں کی لاشوں پر برائے جشن عام
ہو چکے ہیں نصب کتنے فتح مندوں کے خیام

Scanned with CamScanner

کل تھی، جن، زرتار پوشاکوں میں، تاب کہکشاں
آج ویرانوں میں ان کی اڑ رہی ہیں دھجیاں
ہم تو کیا، تاریخ انساں بھی گنا سکتی نہیں
کھا چکی ہے کتنے قاہر تاجداروں کو زمیں
کتنے ایوانوں کو ویراں کر چکا ہے انقلاب
چغد نوبت می زند، بر گنبدِ افراسیاب

عرض کیا گیا ہے کہ نظم خاصی طویل ہے۔ پھر بھی آخری حصّے کے بھی دو تین شعر اور دیکھتے چلیے۔ ان میں حاکم قوم و خادم قوم کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ گویا نہایت شستہ و پاکیزہ لفظوں میں صدر پاکستان کو ناصحانہ درس دیا گیا ہے۔

حاکموں کے سر سے ٹکراتے ہیں پتھر بالعموم
خادموں پر آسمانوں سے برستے ہیں نجوم
حکموں کی شمع بن جاتی ہے پل بھر میں دھواں
خادموں کی مشعلوں سے کانپتی ہیں آندھیاں
حاکموں کی گور بے چادر پہ منڈلاتے ہیں زاغ
خادموں کی قبر پر جلتے ہیں یادوں کے چراغ
نوح کا طوفاں بھی اس کو غرق کر سکتا نہیں
جو برائے خلق جیتا ہے وہ مر سکتا نہیں
یہ گرہ میں باندھ رکھیۓ بات، صدر ارجمند
آپ اگر میری نصیحت پر رہیں گے کار بند
پھر تو اس دنیائے گوناگوں میں تا یومِ حساب
کارنامے آپ کے دمکیں گے مثلِ آفتاب

Scanned with CamScanner

کاش، صدر پاکستان محمد ایوب خاں، جوش کی نظم سن لیتے اور اس پر کان دھرتے، لیکن دنیا میں حاکمانِ وقت کی طرف سے کہاں ایسا ہوا۔ آخر کار محمد ایوب خاں کا حال جمہور اور عوام کے ہاتھوں وہی ہوا جس کی طرف جوش نے اپنی نظم میں اشارے کیئے تھے۔ ہر چند کہ یہ نظم جوش سے گزارش کر کے لکھوائی گئی تھی اور جوش نے اپنے مزاج کے برعکس اس نظم میں اپنے دوستوں کی دلجوئی کا خاص خیال رکھا تھا لیکن اس نظم کا پورا تانا بانا، اس کا اسلوب، اس کا لہجہ، اس کے تیور اور اس کے مواد کی زیریں لہریں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر کا ذہن مارشل لاء حکومت کی مداحی پر آمادہ نہیں ہے۔ طوعاً و کرہاً قلم اٹھایا گیا ہے اور نظم لکھوانے والوں سے کہیں زیادہ اپنے قلب و ذہن کی ترجمانی کی گئی ہے۔ نتیجتاً نہ تو یہ نظم جلسے میں پڑھوائی گئی اور نہ محمد ایوب خاں کی نظروں سے گزاری گئی۔

یہ جوش کے رومانی مزاج کی ایک مثال تھی اور یہ ذہن میں رہے کہ رومانی مزاج ہی حقیقت میں باغیانہ اور انقلابی رجحان کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ رومانی اور کلاسیکی رجحان رکھنے والوں کا بنیادی فرق یہی ہے کہ اول الذکر جذبات و تخیل کے جوش سے معمور اور آخر الذکر پرانے اصول و روایات کا اسیر اور فنی اعتبار سے لکیر کا فقیر ہوتا ہے۔ یعنی جو طبعاً رومانی ہوتا ہے وہی انقلابی سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ خالص کلاسیکی مزاج میں اس طرح کی جراثیم نہیں ہوتے۔ اردو میں غالب، اقبال اور جوش تینوں رومانی شاعر تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی شاعری باغیانہ اور انقلابی روح سے خالی ہے۔

جوش کے ساتھ اتفاق یہ ہوا کہ پاکستان میں ان کی ساری زندگی آمرانہ دور حکومت میں بسر ہوئی۔ زندگی کے آخری دور میں انہیں جس قسم کی مارشل لاء حکومت کا سامنا رہا وہ جوش جیسے آزاد خیال اور باغی مزاج شاعر کیلیئے پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ اس لئے کہ اس میں صرف حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ مفاد پرست ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے بھی جوش کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ جیسا کہ میں نے اور دوسروں نے بھی اس سے

پہلے لکھا ہے کہ جس وقت اکادمی ادبیات پاکستان کی طلب کردہ پہلی اہل قلم کانفرنس اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں منعقد ہو رہی تھی اور صدر پاکستان محمد ضیاء الحق اس کا افتتاح کر رہے تھے عین اسی وقت ان سے کمتر درجے کے شاعر و ادیب، اکادمی کے اساسی رکن بننے کا اعزاز حاصل کر رہے تھے، اور جوش جیسا اردو کا عظیم شاعر اسلام آباد ہی کے ایک گوشے میں کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ اسے جلسے میں شرکت کی دعوت تک نہ دی گئی تھی۔

یہ سارا عمل جیسے گھناؤنی سازش کہنا چاہئے، صرف جوش ملیح آبادی کے لئے نہیں بلکہ کسی بھی حساس آدمی، خصوصاً شاعر و ادیب کیلئے حد درجہ اذیت ناک کہلائے گا۔ اس واقعے کو بظاہر اور اصولاً، حکوت وقت کے اعمال نامے میں لکھا جانا چاہئے لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کے محرک و معاون حقیقتاً وہ لوگ تھے جو خود کو اہلِ قلم کہلوانے کے مدعی ہیں۔ اس لئے کہ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ضیائی مارشل لاء کی آمد اور اکادمی کی پہلی کانفرس کے انعقاد سے کچھ دونوں پہلے، جس وقت اکادمی کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور اس لئے کے فاؤنڈنگ فیلوز (اساسی ارکان) کی جو فہرست تیار کی گئی تھی، اس میں جوش کا نام شامل تھا لیکن جیسے ہی مارشل لاء نافذ ہوا، اس کے حمایتی حلقے کے چھٹ بھیّوں نے اساسی ارکان کی فہرست سے جوش جیسے عظیم شاعر کا نام خارج کرادیا، حالانکہ صرف فرانس کی اکاڈمی نہیں بلکہ سارے مہذب ممالک کی ادبی اکادمیوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص ایک بار، اکادمی کا فاؤنڈنگ فیلو نامزد ہو جاتا ہے، پھر اس کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جوش کے سلسلے میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

اب جوش کے خلاف زیادتی اور بدسلوکی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو اس بدسلوکی کے پس منظر کو بھی مختصراً ذہن میں رکھئے۔ اُوپر بیان کئے ہوئے واقعے سے پہلے جوش نے ریڈیو پاکستان کو ایک انٹرویو اس شرط اور وعدے پر دیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد نشر اور شائع کیا جائے گا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی ہمسایہ ملک کے ابوالکلام آزاد نے اپنی کچھ تحریریں اسی وعدے پر ملک و قوم کے پاس امانت رکھوائی تھیں اور امانت داروں نے اپنے وعدے کا پورا پاس کیا تھا لیکن پاکستان

Scanned with CamScanner

میں ایسا نہیں ہوا بلکہ مفاد پرستوں نے حکومت وقت کے اشارے پر جوش کے انٹرویو کو ان کی زندگی ہی میں شائع کر کے جوش کا نام اکاڈمی کے اساسی ارکان کی فہرست سے خارج کرا دیا۔ اس طرح گویا انہوں نے اپنی دانست میں جوش کو برسرِعام رسوا کرنے کی کوشش کی لیکن سب جانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے جوش نہیں بلکہ ان کے خلاف سازش کرنے والے اہل قلم ہمیشہ کیلئے رسوا ہو گئے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جوش کے خلاف اس طرح کی شرمناک حرکتوں کے خلاف ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے اجتماعی طور پر کوئی احتجاج نہیں کیا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صرف دو چار ادیبوں خصوصاً احمد ندیم قاسمی نے جوش کے خلاف ان بدسلوکیوں پر آواز بلند کی تھی اور احتجاجی کالم بھی لکھے تھے لیکن مذہب کے اجارہ داروں نے ان پر بے دینی کا فتویٰ لگا کر حکومت کی نظر میں ان کی آواز کو صدا بصحرا ثابت کرا دیا۔

مختصر یہ کہ ایک جوش کیا، اس مارشل لائی دور میں کئی معزز اہل قلم کی پگڑیاں اچھلوائی گئیں۔ ان کی ذات پر ناروا حملے کئے گئے، ان کے کردار پر سخت ضربیں لگائی گئیں اور ان کی تخلیقات کو ادیبوں اور شاعروں کے جلسوں میں تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ کام بظاہر حکومت نے کیا لیکن اصلاً یہ کام خود ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ بعض ادیبوں نے ان کی تخلیقات کے خلاف، حکومت کے اہلکاروں کے کان بھرے بلکہ مضامین لکھ دیئے اور جب یہ مضامین جلسے میں پڑھے گئے تو مضمون لکھنے والے حضرات، اشارۃً و کنایۃً اہل جلسہ پر یہ بھی واضح کرتے رہے کہ یہ تحریر ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ہمارے عہد کے ممتاز شاعر جناب اختر حسین جعفری (مرحوم) کو، جن کا ابھی چند سال پہلے ''فنون'' کا خاص نمبر شائع ہوا ہے، خاص طور پر موضوعِ تضحیک بنایا گیا، یہ باتیں سنی سنائی نہیں ہمارے آپ کے سامنے کی ہیں۔

اس عہد جبر و ستم کا تھوڑا سا ذکر یوں کرنا پڑا کہ جوش کا بڑھاپا اسی میں گزرا لیکن واقعات اور ان کی زندگی گواہ ہے کہ انہوں نے حالات سے کوئی مفاد پرستانہ سمجھوتا نہیں کیا، انقلابی نعرہ لگانے کی ہمت نہیں ہوئی تو کسی کی خوش آمد اور کسی کی غیبت کو بھی انہوں نے شعار نہیں بنایا۔ اس

Scanned with CamScanner

آخری دور میں جوش نے جو کچھ کہا، کیا قطعات، کیا رباعیات، کیا نظمیں اور کیا مرثیے سب میں ان کی رومانی سوچ، ان کی انقلابی روح، ان کی باغیانہ طبیعت، الفاظ کی سطح پر نہیں معنی کی تہہ میں موجیں مار رہی ہے۔ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام ''محراب و مضراب'' کا ایک ایک صفحہ یہ ظاہر کررہا ہے کہ وہ زندگی کے وجدانی اور روحانی عنصر کو حیوانی اور مادی عنصر پر ترجیح دیتے ہیں، رومانی و انقلابی سوچ رکھتے ہیں اور زندگی کو تازہ امکانات سے لبریز و بے کراں جانتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی غزل گوئی

جوش کو عام طور پر غزل کا مخالف اور دشمن کہا جاتا ہے۔ میں نے خود بھی شاید کسی جگہ اس کا اظہار کیا ہے یہ بات پوری طرح درست نہیں معلوم ہوتی۔ اول اس لئے کہ ان کی ساری شاعری خواہ جدید رومانی و انقلابی نظموں کے روپ میں ہو یا رباعیات و مثنویات کی شکل میں غزل کے مزاجِ خاص سے ہر طرح ہم آہنگ ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ یقیناً غزل کی ظاہری شکل سے الگ تھلگ ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس میں وہی تغزل وہی نرمی اور وہی مٹھاس ہے۔ جس سے اردو غزل عبارت ہے اس خاص تناظر میں دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جوش دراصل غزل کے مزاج کے نہیں، غزل کی فارم یا ہیئت کے مخالف تھے، ان کا کہنا صرف اس قدر تھا کہ ایک طویل مضمون وضاحت طلب موضوع کو غزل کے ایک شعر میں نہیں سمویا جا سکتا یہ فریضہ صرف نظم ہی انجام دے سکتی ہے اور ان کا یہ کہنا کچھ بے جا نہ تھا۔

دوسری بات یہ بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ خود جوش میں غزل گوئی کا بڑا سلیقہ تھا اور انہوں نے ابتداء میں بعض بہت خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ ابھی میں نے جوش کی غزل کا یہ شعر سنایا ہے۔

تمہیں آئیں سننے کا شوق تھا مگر اب بتاؤ کرو گے کیا
جو کراہتا تھا تمام شب و غریب جوش تو مر گیا

اس غزل کے چند شعر مجھے اور یاد آ رہے ہیں اس کا مطلع تو خصوصیت سے داد کے لائق ہے۔ اس میں کوئی بڑا فلسفہ بیان نہیں کیا بلکہ ایک سیدھی بات یہ کہی گئی ہے کہ ہر آدمی اپنے تجربے کی روشنی میں ہی چیزوں کو دیکھتا ہے اور نتائج اخذ کرتا ہے، مثلاً اگر کسی کو اپنے مقصد میں بار بار ناکامی ہو چکی ہو تو بہتر سے بہتر اور انتہائی سازگار حالات میں بھی اسے کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔ اس کا جی ڈرتا رہتا ہے اور اسے اپنے خوفزدہ لاشعور کا عکس ہی ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ فانی بدایونی نے کیا خوب کہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا اک بے قرار رویا

کم وبیش یہی خیال عندلیب شادانی کے ایک شعر میں یوں ادا ہوا ہے کہ

تیری محبت کا بھی یقین ہے تیری وفاؤں کو مانتا ہوں
مگر مرا دل لرز رہا ہے میں اپنی قسمت کو جانتا ہوں

ان شعروں کی موجودگی میں اس خیال کو خوب تر بنا کر پیش کرنا آسان نہ تھا لیکن جوش نے کر دکھایا اور ایسا مطلع کہہ دیا جو غزل کے شعر کے جملہ محاسن رکھتا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی تم نے ہنس کے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اتر گیا

اس غزل کے دو تین شعر اور یاد آ رہے ہیں ایک سے ایک سادہ وپُر کار ہیں۔

یہ عجیب حسن کے رمز تھے یہ نرالے ناز کے بھید تھے
وہ نقاب اٹھا کہ جو آ گیا کوئی جی گیا کوئی مر گیا
جو بہار ملتی تو پوچھتا کہ کہاں وہ کیف نظر گیا
وہ صبا کی شوخیاں کیا ہوئیں وہ چمن کا حسن کدھر گیا
وہ شکار جلوۂ دہر تھے میں ہلاک پر تو بار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے میں بگڑ بگڑ کے سنور گیا

جوش کی ایک اور غزل قابل ذکر ہے اس غزل کی زمین میں اکثر اساتذہ کی غزلیں ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے یہ دو شعر تو بہت ہی مشہور ہیں کہ

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

Scanned with CamScanner

حسرت تو خیر غزل کے باب میں رئیس المتغزلین کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار خوب ہیں تو حیرت انگیز بات نہیں ہے لیکن جوش کی غزل کے دو شعر دیکھئے۔

اب اے خدا عنایت بے جا سے فائدہ
مایوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
اب سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

یہ کم درجے کے شعر نہیں ہیں۔ ان میں غزل کا وہ کلاسیکی حسن بھی ہے جو حسرت، جگر، اصغر اور فانی وغیرہ کے یہاں ملتا ہے اور وہ لب ولہجہ بھی جو جوش ملیح آبادی کی شاعری کیلئے مخصوص ہے غزل کا یہ نرم عمومی آب ورنگ جوش کی غزلوں میں ان کے عہد کی مروجہ غزل کے زیرِ اثر آیا ہے ان کے اس قسم کے اشعار۔

راس اوّل تو نہ آئے گی زمانے کی فضا
راس اگر دو دن زمانے کی فضا آئی تو کیا

نہ جانے سینہ احساس پر یہ ہاتھ کس کا ہے
طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہوتی جاتی ہے

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

ہر چیز کائنات کی لبریز سے یاس ہے
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

Scanned with CamScanner

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کیے بغیر
وہ اور مان جائیں شرارت کیے بغیر

اس اندازِ غزل گوئی کے عکاس ہیں جس کا سکہ مینائی و داغ دہلوی کی جمائی ہوئی محفل کے تحت لکھنؤ اور دہلی، دونوں میں چل رہا تھا۔ اب رہ گیا جوش کا اسلوب خاص، اس سلسلے میں ان کی غزلوں کے دو تین شعر دیکھیے۔

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

خواب کو جذبہ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا لیکن
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

یہ اشعار غزل کی مروجہ روش سے الگ، خاص جوش کے لہجے اور آہنگ میں ہیں۔ ایسے آہنگ میں جسے بعد کو یگانہ نے اپنی غزل میں اپنایا تھا۔ اور وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔ بعد کو اس لہجے کی بازگشت کہیں سنائی دی تو بہت بعد کو شاد عرفی سلیم احمد اور سرشار صدیقی کے ہاں۔ جوش کی غزل گوئی پر چند مثالوں کے ساتھ اس اظہارِ خیال کا مقصد یہ ہے کہ جوش غزل کے مزاج کے دشمن نہیں تھے۔ وہ معنی کی سطح پر غزل کو نظم جیسی وسعت اور نظم کو غزل جیسی اثر پذیری دینا چاہتے تھے۔ اور اس

Scanned with CamScanner

میں وہ کامیاب بھی ہوئے ان کا مزاج سراپا تغزل تھا۔ البتہ ان کے دل و دماغ میں اس تغزل کی لہریں اتنی زور رس بلند آہنگ اور پر خروش تھیں غزل میں ان کی سمائی مشکل تھی اس لئے انہیں طویل نظموں کا سہارا لینا پڑا۔

جوش کی رومانی و انقلابی شاعری لسانی محاسن سے جس طرح مالا مال ہے اس کا ذکر اس جگہ مناسب نہ ہوگا۔ یہ بہت بسیط وطویل گفتگو کی متقاضی ہے اور اس کا موقعہ نہیں ہے۔ البتہ آج کی محفل میں جوش ملیح آبادی کو بے دین، شرابی اور مذہب کے باب میں دریدہ دہن کہہ کر ان پر کفر والحاد کے فتوے لگانے والوں کا جو ذکر کیا گیا ہے اس پر چنداں برافروختہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اس قسم کی سوچ اور ادبی بصیرت اور بصارت رکھنے والوں پر ترس کھانا چاہئے یہ دراصل ''فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست'' کا مسئلہ ہے ظاہر بین تنگ نظر اور کور ذوق ادیبوں نے تو علامہ شبلی اور علامہ اقبال تک کو نہیں چھوڑا۔ پھر جوش ملیح آبادی کس حساب میں ہیں۔ ان سادہ لوح معترضین کو کون سمجھائے کہ شعر و ادب کو الفاظ کی سطح پر نہیں ان کے معنی اور معنی کی تہہ میں اتر کر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں شعر گوئی میں طنز لطیف و ملیح، بذلہ سنجی و شوخی اور لطائف و مطائبات کی بھی ہمیشہ اجازت دی گئی ہے۔ اندازِ بیان میں ٹیڑھی ترچھی چالوں کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے حتیٰ کہ ثقہ حضرات کی سنجیدہ شاعری کے ساتھ ان کو غزلیات وہجویات بلکہ عریاں گوئی کو بھی کسی نہ کسی نہج پر گوارا کیا گیا ہے اگر ایسا نہ کیا جاتا تو خیام، حافظ، سعدی، بیدل، غالب، میر، اقبال اور نظیر اکبر آبادی تک سبھی کوتا بینوں کی نگاہ میں مطعون و مردود قرار پاتے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے یہاں بظاہر بارگاہ یزدانی کے باب میں شوخی و شرارت اور گستاخی و بے اعتدالی کی درجنوں مثالیں موجود ہیں۔ مجھے علم ہے کہ بعض نے اپنی کج فہمی سے جوش ملیح آبادی کے اس فکر انگیز و بصیرت افروز اور عظمت انسانی کے نقیب شعر:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کیلئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

Scanned with CamScanner

کوحضور اکرم ﷺ کی شانِ مبارک میں گستاخی و دریدہ دہنی قرار دیا ہے حالانکہ جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ رسول ﷺ کے لفظ کے ساتھ جب تک بطور لقب واحترام کوئی مخصوص سابقہ یا لاحقہ استعمال نہ کیا جائے یہ لفظ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ لفظ عربی میں سفیر، ایلچی، مرسل، معتمداور پیامبر وغیرہ کے معنی میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کے مصرف کو اس جگہ آنحضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذاتِ پاک سے منسوب کرنا بذات خود بے ادبی و بدذوقی ہے بعض نے جوش کی اس قسم کی رباعیوں کو بھی

ساقی کا بہر طور نظارہ کر لوں
مرتے مرتے اک اور اشارہ کرلوں
آدم کا ناخلف فرزند ہوں اے جوش
عصیاں سے اگر کبھی کنارہ کر لوں.

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
توہین مزاج نوجوانی کر کے
تو آتش دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

دل ہوتا ہے روبراہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے خودی خدا نہ بن جائیں کہیں
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

Scanned with CamScanner

قابلِ گرفت جانا ہے اور ان میں فکر وفن کی جو حسن کاریاں ہیں انہیں نظر انداز کر کے ان رباعیوں کو ہرزہ گوئی سے تعبیر کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو شعر وادب کی نگاہ سے نہیں ملائیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جن کی تنگ نظری نے علامہ اقبال جیسے مبلغ توحید و عاشقِ رسول ﷺ کو بھی نہیں بخشا۔ علامہ کی مشہور نظم ''شکوہ'' پر تو باقاعدہ ان پر بے دینی و کفر کے فتویٰ شائع کیئے گئے تھے۔ بعد ازاں ان کی بعض نظموں مثلاً ''بہشت'' محاورہ مابین خدا و انسان، حور و شاعر اور ابلیس کی مجلس شوریٰ وغیرہ کے اشعار کی آڑ لے کر ان کو مطعون کیا گیا اور کبھی کبھی اقبال کے اس قسم کے اشعار

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

دل عاشقاں بہ میرو بہ بہشت جاو دانے
نہ نوائے درد منداں نہ غمے نہ غم گسار

کافر بیدار در پیش صنم
بہ زوینداارے کہ خفیہ در حرم
متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اس قسم کے اشعار کی تفہیم میں سطح بینی سے کام لے کر انہیں موردالزام ٹھہرایا گیا ہے۔ جہاں کوتاہ بینی، کج فہمی، تنگ نظری اور کور ذوقی کا یہ عالم ہو وہاں خیام و سرمد رابعہ و طاہرہ اور جوش و

Scanned with CamScanner

یگانہ کی شاعری کیلیے دادواستحسان کی توقع رکھنا مناسب نہیں لیکن کسی کی شپرہ چشمی کا جوش کی عظمت ولسانی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اردو کے ان قادر الکلام شاعروں میں ہیں جن کا شمار اردو کے محسنوں میں کیا جانا چاہئے بات یہ ہے کہ ہر زبان میں عموماً دو قسم کے شعراء ہوتے ہیں ایک وہ جو کسی خاص زبان کی وجہ سے پہنچانے جاتے ہیں اور جب تک زبان زندہ رہتی ہے وہ بھی زندہ رہتے ہیں دوسرے قسم کے چند شعراء وہ ہوتے ہیں جو زبان کے محتاج نہیں بلکہ زبان ان کی محتاج ہوتی ہے اور ان کے لسان عطیات سے خود کو متمول بناتی ہے۔ ذخیرہ الفاظ کے اس تمول سے زبان میں وسعت و وقعت کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور اس کا شمار دنیا کی بڑی اور گراں قدر زبانوں میں ہونے لگتا ہے اور اردو میں میر، غالب، نظیر، انیس، اقبال اور جوش اسی قبیل کے شاعر ہیں یہ اردو کے شاعر ہی نہیں اردو کے محسن و معطی بھی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جوش ملیح آبادی، رُباعیات کی روشنی میں

اتنی بات بہت واضح ہے کہ اردو کی کلاسیکی اصناف شاعری کی، دو روائتیں بہت پختہ ہیں، ایک غزل کی دوسری رباعی کی۔ دونوں اپنی معنوی رفعتوں اور لطافتوں کے سبب ہمارے دل و دماغ کیلئے سامانِ نشاط ہیں اور ہم سب حسب ضرورت وحسب موقع دونوں سے بقدرِ لب و دنداں اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب طبیعت الجھن کا شکار ہو یا حالات سے بیزار ہو اور بات کرنے کو جی نہ چاہتا ہو تو میر احسن کا یہ شعر:

کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

مخاطب کیلئے جواب بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

غزل، اگرچہ کئی شعروں کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن ہر شعر انفرادی طور پر ایک مکمل مضمون ادا کرتا ہے، رباعی، یہ کام دو شعروں کی مدد سے کرتی ہے، غزل میں سہولت یہ ہے کہ ہر بحر اور ہر وزن میں کہی جاسکتی ہے لیکن رباعی کا وزن مخصوص ہے، اس میں ایسی پابندیاں ہیں کہ ہر شخص آسانی سے رباعی نہیں کہہ سکتا۔ بڑے بڑے اساتذہ سے اس میں چوک ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ غالب تک نے دھوکا کھایا ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ رباعی اگرچہ ہمارے یہاں شروع ہی سے ملتی ہے لیکن فارسی کے خیام وسرمد کے پایہ کے شاعر پیدا نہ ہوسکے۔ قابلِ توجہ شاعر پیدا بھی ہوئے تو وہ بھی چھ سات سو سال کے بعد تقریباً بیسویں صدی کے وسط میں اور ان میں سب سے ممتاز نام شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا ہے۔

فارسی میں رباعی، بالعموم تصوف کے مسائل، رندی کے لوازم، حکمت وفلسفہ کے امور اور وعظ و پند کے مضامین سے مربوط رہی ہے اور فارسی کے تقریباً ہر شاعر نے گاہے بگاہے منہ کا ذائقہ بدلنے کیلئے رباعیاں کہی ہیں چنانچہ دو چار رباعیاں ہر فارسی شاعر کے مجموعہ کلام میں مل جاتی ہیں۔ یہی صورت کم وبیش اردو کی ہے، کسی بھی شاعر کا دیوان یا کلیات کھولیے غزل، مثنویات اور

Scanned with CamScanner

قصائد کے بعد چند رباعیاں ضرور نظر آئیں گی اور ان کا تعلق عموماً رندی یا تصوف کے مسائل سے ہوگا۔ ''ساقی'' کا لفظ بطور قافیہ اور ردیف بھی اکثر جگہ ملے گا اور مولانا حسرت موہانی کے الفاظ میں عارفانہ و عاشقانہ شاعری کا لطف دے گا۔ نمونتاً صرف تین رباعیاں دیکھئے، ان سب میں ساقی کا لفظ بطور ردیف آیا ہے۔

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی
بے خود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمارِ شب کا، لا صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ مئے ہو باقی ساقی

(عبدالحیٔ تاباں معاصر میر و میر حسن)

کل رات کو کیا جوش میں آیا ساقی
میرے شیون پہ گنگنایا ساقی
میں نے جو کہا مقصدِ ہستی کیا ہے
ساغر چھلکا کے مسکرایا ساقی

(جوش ملیح آبادی)

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی، کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے کا رنگ روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

(مولانا ابوالکلام آزاد)

۱۹۵۶ء کی بات ہے یہ آخری رباعی میری نظر سے گزری تو یقین نہ آیا کہ مولانا آزاد کی ہوگی۔ خط لکھ کر پوچھا تو مولانا نے تصدیق کی اور یہ بھی لکھا کہ کبھی شعر گوئی میرا محبوب مشغلہ رہا ہے اور گاہے بگاہے اب بھی کہتا ہوں اوپر کی رباعیوں میں کم و بیش ایک ہی طرح کا موضوع نظم ہوا

Scanned with CamScanner

ہے لیکن مفہوم واثر کے لحاظ سے ہر رباعی اپنا الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ عبدالحئی تاباں کی ایک اور رباعی رندیِ کے تعلق سے بہت خوبصورت ہے اس میں جو قافیے استعمال کئے گئے ہیں وہ بڑے پر لطف ہیں اور تاباں کی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ رباعی یوں ہے کہ:

میخانے میں کیا پھر رہی ہے مٹکی مٹکی
زاہد عابد سے دور پھٹکی پھٹکی
قاضی سے ڈرے، نہ محتسب سے کافر
یہ دخترِ رز بھی جس سے اٹکی اٹکی

اسی موضوع اور اسی رنگ سے متعلق مومن خان مومن کی بھی ایک رباعی دیکھئے۔ کیسی خوبصورت ہے:

بے شاہد و بادہ، صبر، توبہ توبہ
اس عمر میں دل پہ جبر، توبہ توبہ
ایامِ شباب اور دل جو، ساقی
فصلِ گل و جوشِ ابر توبہ توبہ

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شباب وشراب اور ان کے لوازم کو اُردو اور فارسی کے شعراء نے طرح طرح سے باندھا ہے اور کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس موضوع خاص کے حوالے سے فارسی میں خیّام اور اردو میں جوش کی بات ہی کچھ اور ہے بلکہ جوش کی رباعیات کا تو محورِ خاص ہی، خیام کی طرح، مے و میخانہ ہیں۔ لیکن ان کے پردے میں انہوں نے کہیں کہیں نہایت حیات افروز باتیں کہہ دی ہیں اور اپنی رباعیات کی معنوی سطح کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ ان کی نظموں کی طرح ان کی رباعیات بھی ان کی وجہ شہرت اور شناخت بن گئی ہیں۔

جوش نے اپنی رباعیات سے اردو شعراء کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ بعض ہم عصر بڑے شاعر بھی رُباعی کی طرف رجوع ہوئے۔ فراق گورکھپوری نے خصوصاً رباعی کو اپنا لیا اور جوش

Scanned with CamScanner

کے رنگ سے بالکل الگ اپنی رباعیوں کا ایک منفرد اسلوب تخلیق کر لیا۔ان رباعیات کا مجموعہ ''روپ'' جیسا کہ خود فراق نے ان کے دیباچے میں لکھا ہے، جوش کی رباعیات سے متاثر ہو کر وجود میں آیا ہے۔

جوش و فراق کے دوش بدوش، بحیثیت رباعی نگار اردو کے ایک اور شاعر قابل ذکر ہیں اور وہ امجد حیدر آبادی ہیں، امجد حیدر آبادی ایک صوفی منش بزرگ تھے اور رباعی گوئی سے خاص شغف رکھتے تھے۔رباعی کے وزن پر تو انہیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ جوش و فراق کا پیش رو کہنا چاہئے رباعی کے وزن میں انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔اپنی رباعیات میں انہوں نے مسائل تصوف کا بیان جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ان رباعیوں کا ایک وصفِ ظاہری یہ بھی ہے کہ ان کے ردیف و قوافی عموماً قدرے طویل ہوتے ہیں اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔نمونتاً دو رباعیاں دیکھئے۔

ہیں مستِ شہود، میں بھی تو بھی
ہیں مدعی نمود، میں بھی تو بھی
یا تو ہی نہیں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود، میں بھی تو بھی

....

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لا حول ولا قوۃ الا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

پہلی رباعی میں ردیف خاصی طویل ہے اور مزہ دے رہی ہے لیکن دوسری رباعی میں یک لفظی قافیہ یعنی انسان، نادان اور شیطان کے سوا، پورا مصرعہ ردیف کے ذیل میں آتا ہے لیکن

Scanned with CamScanner

بات اس خوبصورتی سے کہی گئی ہے کہ رباعی کا معنوی ارتقاء کہیں بھی مجروع نہیں ہونے پایا بلکہ چوتھے مصرعے نے پوری رباعی کے مفہوم کو حیرت انگیز طریقے سے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ اور تیسرا مصرعہ رباعی کے مشہور و معروف وزن کا اشاریہ بن گیا ہے۔

اس طرح کی دو چار اچھی رباعیاں بیشتر اردو شعرائے کے یہاں ملتی ہیں اس سلسلے میں حالی و اکبر اور انیس و دبیر کی بعض رباعیاں خاص شہرت رکھتی ہیں لیکن دو شاعروں، یعنی جوش و فراق کے سوا، اردو رباعی، کسی کیلئے بھی وجہ شناخت و شہرت نہیں بن سکی۔ جوش کا بنیادی وصف نظم نگاری ہے اور فراق کا غزل گوئی۔ بعد ازاں ان کی اگر کوئی شناخت ہے تو وہ رباعی کی وجہ سے ہے۔ جوش کو فراق پر ایک طرح کی برتری بھی حاصل ہے کہ فراق نے جوش سے متاثر ہو کر رباعیاں کہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی رباعیوں پر ایک جگہ بھی کسی کی تقلید کا اثر نہیں پڑنے دیا۔

جوش کی رباعیوں کا ایک مجموعہ ''جنون و حکمت'' کے نام سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ بھی ان کے دوسرے مجموعوں خصوصاً ''مضراب و محراب'' میں بھی کئی سو رباعیاں شامل ہیں جوش نے اپنی رباعیوں کو حقائق حسن و عشق، پیرانِ سالوس، خرابات اور متفرقات کے نام سے پانچ بڑے خانوں میں تقسیم کر دیا ہے ان پانچ خانوں میں زندگی کی اکائی پوری طرح گھر جاتی ہے۔ سموم و صبا کی رباعیوں میں نئے سائنسی انکشافات اور ان کے تخریبی اثرات پر بھی طنز کیا گیا ہے۔ خاص فلسفیانہ نظریات بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ ساتھ ہی گندم نما جو فروش جمہوری طرزِ حکومت پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اس طرح، جوش کی رباعیاں حسن و عشق سے لے کر دور حاضر تک کہ جدید رجحانات و مسائل کی ترجمان بن گئی ہیں۔ ان کا لب و لہجہ ان کی نظموں کی طرح انقلابی اور ان کے سوچنے کا انداز باغیانہ اور ان کا طرزِ بیان پُر جوش ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسی گہری سنجیدگی ایسی فلسفیانہ گہرائی اور اندازِ بیان میں ایسا لطیف ٹھہراؤ بھی مل جاتا ہے جو علاّمہ اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے مثلاً ان کی یہ رباعی خودی و بے خودی کے حوالے سے کیسی خوبصورت ہے۔

Scanned with CamScanner

دل ہوتا ہے رو برآہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے خودی خدا نہ بن جائے کہیں
کر لیتے ہم گناہ گاہے گاہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، جوش اپنی رندانہ طبیعت کی وجہ سے خیام سے بہت قریب ہیں۔ بعض خمریہ رباعیوں کا انداز بیان تو سراسر خیام سے آنکھ ملاتا ہے، ذیل کی رباعیاں دیکھئے:

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
بد مست گھٹا ہے لڑکھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائے گا یہ زورِ شباب
جوش تو آج بانکپن دکھاتا ہوا چل

....

مرنے پہ نوید جاں ملے یا نہ ملے
یہ کنج یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کسر چھوڑ نہ او خانہ خراب
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

....

وہ رات گئے شراب ڈھلنا ہے ہے
وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملنا ہے ہے

اس کے ساتھ جوش کے زورِ بیان اور جذبات کی شدت کا اندازہ لگانا ہو تو مندرجہ ذیل رباعیاں دیکھئے:

Scanned with CamScanner

کیا شیخ ملے گا گلفشانی کر کے
کیا پا لے گا توہینِ نوجوانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

....

ساقی کا پھر رنگ نظارہ کر لوں
مرتے مرتے بھی اک اشارہ کر لوں
آدم کا میں ناخلف ہوں فرزند اے جوش
عصیاں سے اگر کبھی کنارا کر لوں

حُسن و عشق کے باب میں بھی جوش نے بڑی خوبصورت رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیوں کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ خیال کو مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور محاکات حقیقی کا لطف بہم پہنچاتے ہیں۔ مثلاً

سانچے میں گھٹا کے ڈھل رہا ہے کوئی
پانی کے دھوئیں میں جل رہا ہے کوئی
گردوں پہ اُدھر جھوم رہے ہیں بادل
سینہ میں اِدھر مچل رہا ہے کوئی

....

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے کہا جوش مجھے کہتے ہیں
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

Scanned with CamScanner

پیران سالوس اور تنگ نظر مذہبی علماء پر انہوں نے جس لطیف انداز سے پے در پے وار کیے ہیں وہ بعض جگہ اعلیٰ درجے کی ادبی طنز نگاری کا نمونہ بن گئے ہیں صرف ایک رباعی دیکھئے:

وہ رشتہ تسبیح ہیں ہم پھندے ہیں
ہر عیب سے وہ پاک ہیں ہم گندے ہیں
دیکھوں وہ نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا وہ خدا ہیں ہم بندے ہیں

مختصر یہ کہ جوش کی رباعیوں میں بڑی رنگا رنگی اور ہمہ گیری ہے۔ انہوں نے تصوف، فلسفہ، رموز فطرت، اسرارِ حقیقت، عرفانِ ذات، شراب، اس کے لوازم و اثرات، شباب اور اُس کی مقتضیات، رندی اور اس کی کیفیات، فطرت اور اس کے مظاہر و عوامل، الہویت اور اس کے معجزات، انسان اور اس کے نفسیاتی رموز، احساس اور اس کی لطافت، مذہب اور اس کے اثرات و معتقدات، طبقاتی زندگی اور اس کی کشمکش، جمہوریت اور فسطائیت، روزانہ پیش آنے والے نفسیاتی حقائق، جدید سائنسی رجحانات اور ان کے اثرات اور مختلف علوم و فنون کے گوناگوں تصورات کو ایسے فنکارانہ انداز سے رباعی میں قلمبند کیا ہے کہ نظم و غزل کی طرح اردو رباعی کا دامن بھی ان کی بدولت بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس وسعت کا اندازہ کرنے کیلئے صرف چند رباعیاں دیکھتے چلئے۔

بگڑی ہوی عقل سے حماقت بہتر
دھوکے کی محبت سے عداوت بہتر
شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم
سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

....

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری

Scanned with CamScanner

دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

....

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب
سو بار جہنم میں جلانا یا رب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

....

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صلی علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ رز بہ ایں ریش دراز
موقع ہو تو ہر بُت کو خدا کہتے ہیں

....

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ سویا ہے ابھی
روکے روکے سحر کو روکے کوئی

....

یہ نارِ جہنم یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دعوتِ روزِ جزا کچھ بھی نہیں

Scanned with CamScanner

اللہ کو ''قہار'' بتانے والو
اللہ تو ''رحمت'' کے سوا کچھ بھی نہیں

....

جس وقت جھلکتی ہے مناظر کی جبیں
راسخ ہوتا ہے ذات باری کا یقیں
کرتا ہوں جب انسان کی تباہی پہ نظر
دل پوچھنے لگتا ہے خدا ہے... کہ نہیں

ان رباعیوں سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ جوش نے کیسے کیسے نازک اور گھمبیر موضوعات کو اپنی رباعیوں میں سمیٹا ہے دوسرے یہ ان کا بلند آہنگ، اُسلوب ان کی نظموں کی طرح، ان کی رباعیات میں بھی کیسی آن بان اور طمطراق کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ یہی وہ اُسلوب اور رنگِ سخن ہے جو بحیثیت رباعی نگار، جوش کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو نظم کی طرح ان کی شاعری کی شناخت بن گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

جوشؔ ملیح آبادی اور نیاز ونگار

علامہ نیاز فتح پوری کا سالِ ولادت ۱۸۸۴ء اور جوش کا ۱۸۹۸ء ہے اس اعتبار سے نیاز فتح پوری عمر میں جوش سے کم وبیش چودہ سال بڑے تھے۔ پھر بھی دونوں ہم عصر کہلاتے ہیں غالباً اس لئے کہ دونوں کی زندگی کے سیاسی وسماجی حالات اور ان حالات کی تبدیلیوں کا زمانہ ایک ہی ہے دونوں خلاق ذہن کے مالک تھے اور دونوں نے اردو زبان وادب پر انمٹ نشان چھوڑے ہیں۔ نیاز نے نثر کی معرفت شہرت پائی، جوش نے شاعری کی بدولت۔ گویا دونوں کی قلم فرسائی کا رُخ ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھا اور بظاہر دونوں میں معاصرانہ چشمک کا کوئی واضح سبب نظر نہیں آتا۔ پھر بھی، جوش اور نیاز کی باہمی چشمک خاص شہرت رکھتی ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں سے قطع نظر خود جوش ملیح آبادی کا خیال تھا کہ نیاز فتح پوری، اُن سے عناد رکھتے ہیں اور ان کے کلام کو بے جا تنقید کا نشانہ بنا کر اُن کے ساتھ دانستہ زیادتی کرتے ہیں۔ اس بات کا واضح انکشاف اس وقت ہوا جب میں نے ۱۹۶۳ء میں نگار کا نیاز نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نمبر کیلئے جہاں دوسرے ادیبوں سے مضامین لکھنے کی فرمائش کی وہیں جوش ملیح آبادی سے بھی، نیاز کے بارے میں کچھ لکھنے کی گزارش کی پہلے تو جوش صاحب کچھ لکھنے سے گریز کرتے رہے، لیکن جب میرا اصرار بڑھا تو اُنہوں نے ایک مختصر سا مضمون اس طور پر لکھ بھیجا۔

> یادش بخیر یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف ''رُوحِ ادب'' شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرہ گیا ہوا تھا جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانش کدے پر حضرت نیاز سے مجھ کو پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جارہا تھا اور نیاز صاحب آغاز پیری کی جانب مڑنے والے تھے۔
>
> مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم ''جنگل کی شہزادی'' کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی، اور ''رُوحِ ادب'' پر تنقید کا وعدہ بھی کیا تھا (جو کبھی ایفا نہ ہوسکا)۔
>
> اس زمانے میں نیاز صاحب داڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے منہ پر داڑھی مجھ

Scanned with CamScanner

کو اچھی نہیں لگی تھی۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے، اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

میری جھولی میں تو آج بھی بقدر حوصلہ، علم وفکر کی پونجی نہیں ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم وفکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی، نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی۔ اور میں نے ان کو، ان کے میزبان ہوش صاحب بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی، اور شرمناک فحش کلامی کی بناء پر غارت ہوکر رہ گئی۔ وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بناء پر نیاز اور ہوش دونوں کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہوگئی کہ یہ سب کچھ میرے ایماء سے ہوا ہے۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہوگیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں، میں بھی، خیر سے پٹھان ہوں، اور ظاہر کہ مشتعل ہوجانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہوجاتی ہے کہ حالتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمایئے۔

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک ''نگار'' کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرا کرتے رہے اور اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا۔ لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انہوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال نوجوان تھا، لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان

Scanned with CamScanner

پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی، لیکن اپنے دوست اعجاز الحق قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط بھی لکھے۔ جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی مار کر بیٹھا تھا وہیں دفن بھی کر دیا جاتا۔

میں نہایت واضح طور سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی، کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا ہی شخص تسلیم کر لیا تھا، اور اس لئے انہوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی لکھا وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فیصد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے، تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیع اوقات ہے، اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اُبلتی جوانی اور اس اُبلتی جوانی کے گرجتے برستے اشتعال میں کس کی یہ مجال تھی کہ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا

اس لئے میرے جواب نہ دینے کو، براہ کرم، میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے کہ

بنیاد تھی اس کی، ناتوانی میری

بہر حال وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا، اب ہم دونوں ضارب و مضروب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں، لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزل عمر میں ہمارے واسطے یہ نازیبا، اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بناء پر امر حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لئے کامل ذہنی دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیاز ان چند انے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں، یہ دون پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آ رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں،
اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اتری ہوئی
ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگاؤں۔

کاش نیاز فتح پوری کا سا خالقِ طرز انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے

ہائے وہ عقل، جو نرغے میں ہو دیوانوں کے

جوش کے اس مضمون میں نیاز فتح پوری سے چشمک کا پس منظر بلکہ پیش منظر سب ہی کچھ سامنے آ گیا ہے۔ بعد ازاں نیاز فتح پوری، زیادہ دنوں حیات نہ رہے اور باہمی نوک جھونک یا چشمک کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا مگر جوش کے اس مضمون سے یہ ضرور ہوا کہ نیاز کے دل میں جوش کیلئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا اگر کسی طرح کی کوئی بدگمانی تھی تو وہ بھی تو دور ہو گئی ثبوت اس کا یہ ہے کہ نیاز نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے، جوش کے بارے میں ایک مضمون لکھا اور یہ کہہ کر میرے سپرد کیا کہ اسے میری وفات کے بعد شائع کیجئے گا۔ میں نے یہی کیا یعنی اُن کے مضمون کو خاصے عرصے بعد ۱۹۸۲ء میں اس اس وقت شائع کیا گیا جبکہ صبا لکھنوی نے ''بیادِ جوش'' کے عنوان سے ''افکار'' کے خاص نمبر کا اہتمام کیا نیاز کا مضمون بھی دیکھتے چلئے۔

''جوش کی صحیح عظمتِ شاعرانہ''

کچھ عرصے سے کراچی کے ایک نہایت مشہور اور وسیع المطالعہ مفکر و ادیب کا مجھ سے اصرار ہے کہ میں جناب جوش ملیح آبادی کی شاعری کی بابت اپنی رائے ایک بار پھر ظاہر کر دوں۔ کیونکہ غالباً بعض دیگر حضرات کی طرح جوش کی چند نظموں پر میری تنقید دیکھ کر وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں جوش کی شاعری کا قائل نہیں۔

ان بزرگ کی اس فرمائش کی تعمیل اس میں شک نہیں بڑی طویل گفتگو چاہتی ہے، لیکن اگر میں چاہوں تو اسے مختصر ترین الفاظ میں بھی ظاہر کر سکتا ہوں اور اس وقت ارادہ یہی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ میں نے جوش کی بعض نظموں پر بڑی سخت جارحانہ تنقید کی ہے اور اس کی بناء پر یہ خیال قائم ہو سکتا ہے کہ میں جوش کو معمولی درجے کا شاعر سمجھتا ہوں، لیکن باور کیجئے کہ

Scanned with CamScanner

یہ خیال کبھی ایک لمحے کیلئے بھی میرے دل میں نہیں گزرا اور میں نے ہمیشہ جوش کو اپنے عہد کا بڑا اچھا، بڑا اہل اور بڑا خوش فکر شاعر سمجھا اور اب بھی ان کی اس اہلیت کا معترف ہوں۔

جوش کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اور ان کے ہر رنگ کو سراہنے والے اب بھی موجود ہیں، لیکن میں جس وقت ایک شاعر کے مجموعہ کلام کو دیکھتا ہوں تو صرف ایک نقطۂ نظر میرے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے کلام کا کون سا حصہ باقی رہ جانے والا ہے اور جب آئندہ نسلیں اس کا ذکر کریں گی تو بقائے دوام کی مہر کن کن نظموں پر لگائیں گی اور وہ کیوں ان کے یاد رکھنے پر ہمیشہ مجبور رہیں گے۔ جوش کے یہاں علم وفکر کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اظہارِ خیال نہ کیا اور ان کی شاعری کے ہر رنگ کے چاہنے والے انہیں مل گئے۔ لیکن ان کی شاعری کا وہ پہلو جو صرف تعلّی سے تعلق رکھتا ہے مجھے ہمیشہ اجنبی سا محسوس ہوا اور لطف کی بات یہ ہے کہ جوش کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی تعلّیاں بھی بڑھتی گئیں جن کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور اب شاید یہ شاعری انہیں زیادہ آسان نظر آتی ہے۔

قاآنی کے رنگ میں بہت سے ہم قافیہ، خوش آہنگ اور زوردار الفاظ ایک جگہ جمع کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں کیونکہ اس کا تعلق شاعری سے زیادہ فرہنگ نویسی سے ہے اور ایک شاعر کا مرتبہ یقیناً فرہنگ نویسی سے بلند تر ہے۔

اسی طرح رُباعی نگاری کے سلسلے میں اُنہوں نے جو رنگ اختیار کیا ہے وہ بھی محض تعلّی ہی ہے۔ پتھر کو نچوڑ کر زمزم و شبنم ٹپکا دینے والے شاعر محض ناظم ہیں، شاعر نہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جوش کو میں بڑا زبردست شاعر سمجھتا ہوں اور جب ان کی نظم نگاری کا وہ دور میرے سامنے آتا ہے، جب ان میں شاعر و مفکر، نقاش و فیلسوف سب پوری قوت سے ایک جگہ کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے تو میری روح جوش کی شاعری کے سامنے دوزانو ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سواء اس مخصوص رنگ کے جوش نے اور جو کچھ کہا ہے وہ سب نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو بہتر ہے۔

الغرض میں نے جوش کو ہمیشہ بڑا زبردست شاعر سمجھا۔ لیکن ان کی جن نظموں نے براہ راست میرے دل و دماغ کا سودا کیا ان میں ایک نظم ''فریبِ ہستی'' بھی ہے اگر جوش اس نظم کے سواء اور کچھ نہ کہتے تو بھی میں حالی اور اقبال کی صف میں لا کر انہیں بٹھا دیتا۔

Scanned with CamScanner

جوش اور نیاز کے مندرجہ بالا مضامین سے وہ ساری غلط فہمیاں تقریباً دور ہو گئیں جن میں سے بعض تو نیاز صاحب کے اُن تنقیدی مضامین نے پیدا کر دی تھیں جن میں مالہ وماعلیہ کے حجت صف اوّل کے دوسرے بڑے شاعروں کے ساتھ جوش کی نظموں پر تنقید کی جاتی تھی ساتھ ہی ان بدگمانیاں اور غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو گیا جو نیاز اور جوش کے درمیان ہم عصر ادیبوں نے پیدا کر دی تھیں اور جن کی اساس نیاز و جوش کو بلا کسی دلیل و جواز کے ایک دوسرے کا حریف و معاند خیال کیا جانے لگا تھا۔

مضمون لکھوانے کے سلسلے میں جن بزرگ و معتبر ادیب کی طرف اشارہ ہے وہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی تھے جن سے نیاز صاحب کے دیرینہ روابط تھے اور کراچی سے نہیں لکھنو سے تھے۔

بین المملکتی مشاعرہ اور کراچی میں جوش کی پہلی آمد

یادش بخیر ۵۴، ۵۵ سال پہلے یعنی ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ملیر سٹی میں میرا قیام تھا۔ گردونواح میں کوئی اسکول نہ تھا۔ یہ دیکھ کر استعجاب بھی ہوتا تھا اور دکھ بھی۔ بالآخر احباب نے "انجمنِ تعلیمات ملیر رجسٹرڈ" کے تحت ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ری پبلک اسکول کی بنیاد ڈالی۔ سندھ کے پیر خانوادے کے ممتاز فرد اور علم دوست صنعت کار جناب پیر محفوظ علی، اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ مجلسِ منتظمہ میں مولانا سعید الرحمٰن رہبر کانپوری، سید رشید احمد رومی ایڈوکیٹ، عبدالعزیز جعفری اور ریاض الحق وغیرہ کے ساتھ راقم الحروف بھی شعبہ نشر واشاعت کے انچارج کی حیثیت سے شامل تھا۔

"ری پبلک اسکول" میں آٹھویں جماعت تک کے ڈیڑھ سو طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔ یہ اسکول چند کمروں کی اُس لمبی بیرک میں تھا جو اس وقت گرڈگل بلڈنگ کہلاتی تھی اور جس میں بعد کو جامعہ تعلیم ملّیہ کا ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا۔ ری پبلک اسکول، چندے سے چلتا تھا اور نظامت تعلیم کوئی مدد دینے پر رضامند نہ تھی۔ چنانچہ اسکول کی مالی خستگی کو دور کرنے کیلئے ایک بین المملکتی مشاعرے کا پروگرام بنایا گیا اس مشاعرے کے کنوینز اور انتظامی کمیٹی کے سیکریٹری کی ذمہ داریاں مجھ پر ڈالی گئیں۔ ۸ مارچ ۱۹۵۲ء مشاعرے کی تاریخ طے پائی اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا۔

پاکستان کے ممتاز شعرا کے ساتھ ہندوستان سے جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، سردار جعفری، ساغر نظامی، مجروح سلطان پوری، اثر لکھنوی، نشور واحدی اور شعری بھوپالی کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ علامہ نیاز فتح پوری کو صدارت کیلئے منتخب کیا گیا۔ ان حضرات میں سے بعض کو اجازت نامے نہ مل سکے۔ بعض نے نجی مجبوریوں کے تحت شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ فراق، جوش، نیاز، اثر اور شعری کی آمد کے امکانات پیدا ہوگئے۔ جگر صاحب پہلے ہی سے پاکستان میں تھے۔ یہ بات اس جگہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ ان

Scanned with CamScanner

بزرگوں نے مشاعرے میں شرکت کیلئے کسی زرِ پیشگی یا بھاری معاوضے کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اپنے پہلے خط میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ''انجمن'' مالی خستگی کے سبب سفر خرچ کے سوا کچھ اور پیش نہ کر سکے گی۔ ہاں مشاعرے کے سبب اگر ''انجمن'' توانا ہو گئی تو وہ ہر ممکن خدمت کرے گی۔

نیاز فتح پوری سے میرے تعلقات کئی رشتوں سے استوار تھے، اثر لکھنوی کے بھانجے سید نواب علی گوہر مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں میرے استاد بھی رہے اور پھر مجھے کئی سال ان کے رفیق کار ہونے کی سعادت بھی حاصل رہی۔ اُن کی معرفت، میں اثر صاحب سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ فراق گورکھپوری کی دو حقیقی بہنیں فتح پور میں بیاہی تھیں اور ان کے دونوں بہنوئی، اس مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے معاونین خاص میں تھے جس کی بنا مولانا سید ظہور الاسلام نے ڈالی تھی، جس میں مولانا حسرت موہانی، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالرزاق کانپوری جیسے بڑے اسکالروں نے تعلیم پائی تھی اور جس کے سالانہ مشاعروں میں برصغیر کے نامور شعراء شرکت کرتے تھے۔ اس پس منظر میں، فراق تک میری رسائی بہت پہلے سے تھی۔ میں انہیں کئی بار فتح پور بُلا چکا تھا بلکہ ایک دفعہ ڈاکٹر ابو محمد سحر اور تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی) جب ان کے ساتھ مشاعرے میں شریک ہوئے تو ایک ایسا ہنگامہ خیز لطیفہ پیش آیا کہ ہم تینوں کی زندگی میں یادگار رہے گا۔ شعری بھوپالی سے بھی پرانی یاد اللہ تھی اس لئے نیاز، فراق، اثر اور شعری بھوپالی میں سے کسی نے بھی میری دل شکنی گوارا نہ کی، اور مشاعرے میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ البتہ حضرت جوش ملیح آبادی نے ایک دو خطوں کے بعد دہلی سے لکھا:

۵۲-۱-۳۰، دہلی

مکرمی یاد آوری کا شکریہ

بہت مناسب، میں کرایہ نہیں لوں گا لیکن آپ یہ کریں کہ پاکستانی ایک ہزار روپیہ جو ہندوستانی سکے کے لحاظ سے چودہ سو چالیس ہوتا ہے، اپنے ہائی کمشنر اسمٰعیل صاحب کی معرفت مجھے یہاں بھجوا دیں اور مشاعرے کی تاریخ سے مطلع فرمائیں۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ نیاز مند جوش

Scanned with CamScanner

اس کے جواب میں، میں نے جوش صاحب کو ایک بڑا ہی عاجزانہ خط لکھا، جوش صاحب پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ جواباً تحریر فرمایا

مکرمی، یاد آوری کا شکریہ قبول فرمایئے!

میں ایک دریا دل آدمی ہوں، آپ جس محبت سے طلب فرما رہے ہیں اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی جیب سے خرچ کر کے آتا۔

میری مصیبت یہ ہے کہ سفر میں، میرے مصارف کا دائرہ ہمیشہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اور اس کے علاوہ کراچی سے لاہور اور راولپنڈی بھی جانا لازمی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس طویل سلسلہ سفر میں سفر خرچ وغیرہ کے بعد میرے پاس کم سے کم ہزار روپے تو ضرور ہی ہونا چاہیئے۔

لیکن آپ پر میں یہ بار کیوں ڈالوں اور آپ کی مالی حالت پر نگاہ کر کے یہ غیر ہمدردانہ روش کیوں اختیار کروں؟ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ راجستھان سرکار سے جس کی سعی کر رہا ہوں، اگر جلد میرے الاؤنس کی چڑھی ہوئی رقم آ گئی تو میں اپنے ذاتی مصارف سے کراچی پہنچ جاؤں گا اور میں پہنچ سکا تو اس خیال سے مجھے روحانی مسرت ہو گی کہ میں نے آپ کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

اگر خدانخواستہ وہ رقم وقت پر نہ آ سکی تو یقین فرمایئے مجھے آپ سے کم اس کا ملال نہیں ہو گا کہ میں آپ کی دعوت قبول کرنے کی مسرت سے محروم رہا۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ ضیاء عباس صاحب کو بھی خط لکھ رہا ہوں ان کی خدمت میں میرا سلامِ شوق پہنچا دیجئے اور علی اختر صاحب سے سلام کے بعد طویل خاموشی کا شکوہ بھی کر دیجئے گا۔ نیاز مند جوش

بایں ہمہ ہندوستان سے آنے والے بزرگوں کی طرف سے میں زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اول اس لئے کہ اس وقت ہندوستان و پاکستان کے سیاسی روابط خوش گوار نہ تھے اور آمد و رفت کے اجازت نامے مشکل سے ملتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان میں بعض شعراء خصوصاً جوشؔ اور فراقؔ کے

Scanned with CamScanner

بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بڑی پیشگی رقم کے بغیر اس قسم کے مشاعروں میں شرکت ہی نہیں کرتے، خواہ وعدے کتنے ہی پختہ کیوں نہ کرلیں۔ میں بھی کراچی میں نووارد ہی تھا۔ حلقہ احباب اور وسائل محدود تھے۔ ذمہ داری بہت بڑی تھی۔ ذہنی الجھن میں رہتا تھا اور تو اور خود سید ہاشم رضا صاحب جو اس وقت کراچی کے ناظم اعلیٰ تھے اور جن کے ہاتھ سے اجازت نامے جاری ہو رہے تھے۔ ہمارے دوستوں کو یہ کہہ کر خوف زدہ کر دیتے تھے کہ جن حضرات کو آپ لوگ بلا رہے ہیں ان میں سے ایک بھی آنے والا نظر نہیں آتا۔

ایسی اُلجھن میں ان حضرات کی تاریخِ روانگی سے ایک دن قبل، میں نے انڈین ایئر لائنز دہلی کو ٹرنک کال کیا اور یہ معلوم کیا جن لوگوں کی سیٹس بُک کروائی گئی ہیں ان میں سے کس کس نے ٹکٹ حاصل کر لئے ہیں۔ جواب ملا جوش صاحب کے سواء سب نے ٹکٹ لے لئے ہیں۔ اس خیال سے کہ ٹکٹ کے پیسے ضائع نہ جائیں میں نے جوش صاحب کی سیٹ منسوخ کرادی۔ اب میرے مہمانوں میں صرف نیاز، فراق، اثر اور شعری رہ گئے تھے۔ لیکن ایئر پورٹ پہنچنے پر جب میں نے دیکھا کہ جوش صاحب بھی نیاز صاحب کے پیچھے پیچھے جہاز سے اترے چلے آرہے ہیں تو میری خوشی اور حیرت کی انتہاء نہ رہی۔ میرے دل میں جوش کی قدر و قیمت بحیثیت انسان، پہلے سے دوچند ہوگئی۔ میں ان کی بڑائی کا قائل ہوگیا اور حالی کے انداز میں ان کی غزل کا یہ شعر خود بخود میری زبان پر آ گیا

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

یہ حضرات ۶ مارچ کو یعنی مشاعرے سے دو روز قبل کراچی پہنچے، اثر صاحب کو میرے دوست تصدق بیگ اپنے گھر لے گئے نیاز صاحب نے اپنے برادر نسبتی کے ساتھ قیام کرنا پسند کیا۔ جوش، فراق اور شعری کو برسٹل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ جگر صاحب کراچی ہی میں تھے۔ ان کے بعض مصاحبین نے انہیں ایسا بھڑکایا کہ وہ بمشکل مشاعرے میں شریک ہوئے۔ فہرست شعراء کی تیاری میں تقدیم و تاخیر کی نزاکتیں پیدا ہوئیں، لیکن آخر سارے مرحلے طے پا گئے۔ وقتِ مقررہ پر

Scanned with CamScanner

مشاعرے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ ہماری مجلس استقبالیہ کے صدر جناب حفیظ جالندھری صاحب نے دلچسپ انداز میں مہمانوں کو استقبالیہ خطبہ دیا۔ نیاز فتح پوری نے ''سرزمین سندھ کا ایک رومان'' کے عنوان سے بصیرت افروز خطبہ پڑھا، بعدازاں مشاعرہ شروع ہوا اور رات گئے تک جاری رہا۔ جوش صاحب نے رباعیات کے علاوہ اپنی طویل و تازہ نظم ''ماتمِ آزادی'' بھی سنائی۔ پاکستانیوں نے پہلی بار سُنا دل کھول کر داد دی۔ ہر طرف سے واہ واہ، واہ واہ، سبحان اللہ کی آواز بلند ہوئی۔ اس تاریخی نظم کے بعض بند آج بھی میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔

اے ہم نشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ روداد جام بخشئ پیرِ مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گُل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زباں میں پھولوں کے نام سے

شادی ہوئی تو غم کے خزانے لُٹا دیئے کچھ یوں دیئے جلائے کے دل ہی بُجھا دیئے
سہرا بندھا تو شرم کے پردے اُٹھا دیئے مہندی لگی تو خون کے دریا بہا دیئے
دولہا بنے تو حدِ مسرت سے بڑھ گئے
گھوڑے کے لات مار کے سولی پر چڑھ گئے

چلنے لگی لُغت پہ چُھری انتقام کی چھانٹی گئیں تمام جو لغطیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی گدّی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی
حیوان بوکھلائے، منہ کھولنے لگے
انساں بولیاں وہ نئی بولنے لگے

غدّار تھے جو کل وہ محبِ وطن ہیں آج بدخواہِ باغ، ہمدمِ سرد، سمن ہیں آج
کل تک تھے جو سموم، نسیمِ چمن ہیں آج خسرو کے جو غلام تھے، وہ کوہکن ہیں آج
لچھمن کا دل ہے شدّتِ غم سے پھٹا ہوا
در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

Scanned with CamScanner

وحشت روا، غبار روا، دشمنی روا
ہل چل روا، خروش روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا
القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی روا
انسان کے لہو کو پیو، اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

سرو سہی نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم، نہ جوانی نہ جوئے بار
گلشن نہ گل بدن نہ گلابی نہ گل عذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

مشاعرے کا دوسرا دن انتظامی امور کو سمیٹنے میں گزرا۔ ۱۰ مارچ کی شام کو انجمن کے صدر جناب محفوظ علی صاحب کے گھر ''محفوظ فارم ملیر'' میں عشائیہ اور شعری نشست کا اہتمام تھا۔ نیاز فتح پوری اور اثر لکھنوی نے بوجوہ، معذرت کر لی۔ شعری بھوپالی بھی نہ پہنچ سکے۔ جوش اور فراق، ذوالفقار علی بخاری صاحب کے ساتھ ان کے گھر ایسے شغل میں مست تھے کہ اُٹھانا مشکل ہو گیا اُدھر پیر محفوظ صاحب کے یہاں حفیظ جالندھری، سید ہاشم رضا اور دوسرے مہمان پہنچ چکے تھے۔ فون پر فون آ رہے تھے۔ ارم لکھنوی نے اس موقع پر مدد فرمائی اور میں تقریباً ۹ بجے ان سب کو لے کر پیر صاحب کے یہاں پہنچ گیا محفل میں جان آ گئی۔ کھانے پینے کے ساتھ ساتھ لطیفے، ہنسی مذاق اور معاصرانہ نوک جھونک کے مناظر دیکھنے میں آئے۔ اسلام کا دم بھرنے والے بہتوں کی پارسائی کا بھرم مجھ پر کھلا۔ فراق صاحب اپنی شوخِ طبع سے مجبور، مسلسل حفیظ جالندھری پر فقرے کستے رہے اور غزل کے بجائے ترنم کے ساتھ شاہنامہ سُنانے پر اصرار کرتے رہے۔ جب حفیظ صاحب کسی طرح رضامند نہ ہوئے تو خود اپنی ایک غزل حفیظ کے انداز میں ترنم سے شروع کر دی، محفل مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ دو بجے رات کو تقریب اختتام کو پہنچی۔

نیاز، اثر اور شعری کچھ دنوں کیلئے ٹھہر گئے۔ لیکن فراق اور جوش فوراً واپس چلے گئے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میں جوش صاحب کو رخصت کرنے کیلئے ایئر پورٹ نہ پہنچ سکا۔ سخت متاسف بھی

Scanned with CamScanner

تھا شرمندہ بھی۔ میری شامتِ اعمال کہ اپنی اس کوتاہی پر معافی مانگتے ہوئے جوش صاحب کو ایک خط ڈال دیا۔ جواب آیا۔

(دہلی، ۳-۵-۵۲)

حضرت یاد آوری کا شکریہ۔

آپ کیوں ہوائی، موقف پر نہ پہنچ سکنے پر اظہارِ ملال فرماتے ہیں یہ تو بانیانِ مشاعرہ کی طبیعت ثانیہ اور داعیانِ مجلس شعر و سخن کی سنتِ جاریہ ہے کہ جب ''شاعر لوگ'' آئیں تو ہاتھیوں پر آئیں اور جب جائیں تو گدھوں پر جائیں۔

پس وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ افسوس کرے آپ کی بلا۔ نیاز مند جوش

میں اس جواب سے اتنا خجل رہا کہ بہت دنوں تک خط لکھنے کی ہمت نہ ہوئی، لیکن بعد کو میں نے انہیں منا لیا، چنانچہ ۱۹۵۴ء میں جب وہ دوبارہ کراچی آئے اور سنٹرل ہوٹل میں ٹھہرے تو میں تقریباً روزان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین اور آغا آفتاب قزلباش کا بھی یہی معمول تھا۔ اس زمانے کے بہت سے لطیفے اور بہت سی دلچسپ باتیں ذہن میں اُبھر رہی ہیں۔ لیکن انہیں اس جگہ چھیڑنے کا موقع نہیں۔ البتہ ایک واقعہ مجھے یاد رہے گا اور اس کا اجمالی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

میں اُڈٹ کے مقابلے کا امتحان پاس کر کے، اے، جی، پی، آر کے تحت ڈویژنل اکاؤنٹنٹ ہو گیا تھا۔ کبھی پی، ڈبلیو، ڈی کے دفاتر اور کبھی اے، جی آفس میں کام کرتا رہتا تھا۔ اس وقت دفتر میں سجاد باقر رضوی، عابد حشری، رضی اختر شوق، حبیب صدیقی، منجھو بھائی، اسحٰق اطہر صدیقی اور نہ جانے کتنے لوگ ایسے تھے جنہیں شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ میرے مضامین نگار (لکھنؤ) افکار کراچی اور ادبِ لطیف (لاہور) میں چھپنے لگے تھے اور دوستوں پر خواہ مخواہ کا رعب ڈالے ہوئے تھے۔ اس دفتر میں کام تو کچھ ایسا نہ تھا لیکن جی نہ لگتا تھا۔ سب وہاں سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھے۔ میرا چھٹکارا بہت مشکل تھا کہ میں پانچ سال سے پہلے ملازمت چھوڑنے پر پانچ ہزار روپے نقد جمع کرنے کا بانڈ بھر چکا تھا۔ اور یہ عملاً میرے بس کی بات نہ تھی۔ حالانکہ جس چھوٹی

Scanned with CamScanner

سی پوسٹ پر میں تھا اس کیلئے اس وقت بھی بعض حضرات پچاس ہزار تک نقد خرچ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ پوسٹ ہی کچھ ایسی تھی۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس زمانے میں ڈھاکے سے سید محمد جمیل صاحب اے، جی ہوکر کراچی آ گئے۔ بڑے متقی اور دین دار آدمی تھے۔ ایک نجی کام کے سلسلے میں انہیں جوش صاحب سے ملنے کی ضرورت پڑ گئی۔ سبیل کی تلاش میں تھے، کہ کسی نے غالباً سجاد باقر رضوی نے انہیں میرا سراغ دے دیا۔ طلبی پر حاضر ہوا کہنے لگے اے، ڈی، اظہر صاحب مشیرِ مالیات حکومت پاکستان کی صدارت میں دفتر کی طرف سے میلاد شریف کا جلسہ کرنا ہے اور جوش صاحب کی شرکت اس میں ضروری ہے۔ جوش صاحب کہاں ملیں گے، مجھے اُن سے اور بھی کام ہے۔ آپ میرے ساتھ چلئے اور انہیں رضامند کیجئے۔ چاروناچار ساتھ جانا پڑا۔ تعارفی گفتگو ہوئی، اور جلسے میں جوش صاحب کو لانے کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی گئی۔ میں شام کو جوش صاحب سے ملا اور اپنی نوکری اور ذہنی اُلجھن کے حوالے سے اُنہیں تیار کر لیا۔ ستم یہ کہ جلسہ سہ پہر کو تھا۔ یہ جوش صاحب کے آرام کا وقت تھا، لیکن خوشامد درآمد کر کے، ظہر کے بعد اُنہیں اے، جی، پی، آر کے دفتر لے گیا۔ جوش صاحب نے ''شمعِ ہدایت'' نامی نظم سنائی اور داد وصول کی اور فرش پر بیٹھ گئے۔ لیکن جب سلام کیلئے لوگ کھڑے ہوئے اور سلام پڑھنے والوں نے طول کھینچا تو جوش صاحب میرا کاندھا پکڑ کر وہاں سے تیز قدم چل نکلے، بہت روکا، نہیں رُکے، شاید تھک گئے تھے۔ قریب کی کینٹین میں چائے پی اور جمیل صاحب یا اظہر حبیب صاحب سے ملاقات کئے بغیر، جلسے کے اختتام سے پہلے واپس چلے گئے۔ جمیل صاحب کی ضرورت کچھ اس نوع کی تھی کہ وہ نہ تو جوش صاحب سے بددل ہوئے اور نہ مجھ سے ناراض۔ بلکہ مجھے دفتر بُلا کر خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے بھی کوشش کر کے جوش صاحب سے جب ان کا مستقل رابطہ قائم کرا دیا تو ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا ''کوئی کام میرے لائق ہو تو بتانا'' میں نے عرض کیا استعفیٰ منظور نہیں ہوا اور بانڈ کے پانچ ہزار روپے طلب کئے جا رہے ہیں کہاں سے لاؤں؟ غور سے میری بات سنی، فائل کے ساتھ متعلقہ افسر کو طلب کیا اور آن کی آن میں میری جان اے، جی کے دفتر اور آڈٹ کے شعبے سے چھوٹ گئی۔ جوش صاحب نے بھی جمیل صاحب کا ایک ایسا کام کر دیا کہ جمیل صاحب مجھ سے بھی ہمیشہ خوش

رہے اور جوش صاحب کے بھی مداح رہے۔

اُسی زمانے کے آس پاس کی بات ہے کہ رسالہ ''مشرب'' یا آغا سرخوش کے ''ترنگ'' میں میرا ایک مضمون ''جوش کی غزلیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس وقت تک جوش کی غزلوں کو کسی نے درخورِ اعتنا نہ جانا تھا۔ خود جوش صاحب ہمیشہ غزل کو گردن زدنی قرار دیتے رہے حالانکہ میرے نزدیک آج بھی ان کی شاعری کا وہی حصّہ زندہ رہنے والا ہے جس پر غزلیت کی چھاپ ہے۔ بہر حال میرا مضمون چونکہ جوش کی شاعری کے ایک نئے پہلو پر تھا اس لئے عام طور پر پسند کیا گیا۔ مضمون کے حقیقی محرک جوش صاحب کی غزلوں کے وہ اشعار تھے جو ہائی اسکول کی طالب علمانہ زندگی ہی سے میرے ذہن میں محفوظ تھے اور جن سے میں تنہائی میں گنگنا کر اکثر لطف لیتا تھا۔ یہی اشعار جا بجا مضمون میں بطورِ مثال دیئے گئے تھے۔ ان میں یہ شعر بھی تھا۔

رسمِ عالم پر نہ جا دیکھ اپنی افتادِ طبع
دہر کو اپنی روش پر کھینچ لانا چاہئے

''اس شعر کے لفظ ''طبع'' پر نشان لگا کر میں نے حاشیے میں لکھا۔ اس شعر میں ''طبع'' کا لفظ بروزن ''فَعَل'' لایا گیا ہے۔ اصل نقطہ بروزن محل ''فعل'' ہے۔ یعنی ''ب'' متحرک نہیں ساکن ہے''۔ جوش صاحب کی نظر سے جب میرا یہ مضمون گزرا تو اُنہوں نے مجھے ایک خط میں لکھا۔

اولڈ سکریٹریٹ

حضرت غضب ہی کر دیا آپ نے۔ میرے شعر میں ایک غلط لفظ داخل اور صحیح لفظ خارج کر کے خود آپ ہی نے اس پر اعتراض کر دیا۔

بندہ پرور میں نے کہا ہے:

رسمِ عالم پر نہ جا دیکھ اپنی افتادِ مزاج

آپ نے ''مزاج'' کو طبع کر دیا اور غور نہ فرمایا کہ ایسی جاہلانہ غلطی کا میں کیوں کر ارتکاب کر سکتا تھا۔ نیاز مند جوش

یقین نہ آیا کہ میں نے ایسی غلطی کی ہوگی اور حافظے نے اتنا بڑا دھوکا دیا ہوگا۔ ''شعلہ ذ

Scanned with CamScanner

شبنم"، میں غزل تلاش کر کے دیکھی جوش صاحب سر تا پا صحیح اور میں یک سر غلط ثابت ہوا۔ خفت اور ندامت تو بڑی ہوئی۔ لیکن یہ بات ہمیشہ کیلئے گرہ میں باندھ لی کہ حافظے پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنا، بہت بڑی حماقت ہے، اسی حماقت کی بدولت بڑے بڑوں نے مار کھائی ہے، چنانچہ اب مجھے جہاں کہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے حوالہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ باتیں جس زمانے کی ہیں اس میں ساحل بلگرامی اور عالمگیر قدر صاحب کو جوش صاحب کے سب سے بڑے خدمت گزاروں میں شامل کیا جاتا تھا۔ جوش صاحب جہاں کہیں جاتے، انہیں کی مرضی اور معیت میں جاتے۔ جو لوگ جوش صاحب کو بلاتے وہ سب سے پہلے ساحل صاحب اور عالمگیر صاحب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ حضرات بھی جوش صاحب کی مصاحبت کو اپنے حق میں باعثِ افتخار جانتے، دامے درمے نہ سہی قدمے سخنے ہر قسم کی خدمت کو تیار رہتے۔ جوش صاحب جب سندھی مسلم لیگ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے تھے تو عالمگیر قدر اور ساحل بلگرامی میں مصاحبانہ رقابت شروع ہوگئی تھی۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۶ء کو جب میں نے اپنے گھر (ملیر) پر سہ پہر کو ایک شعری نشست رکھی اور جوش صاحب کو شرکت کی دعوت دی تو دونوں بزرگ بھی ساتھ تھے۔ اس خیال سے کہ جوش صاحب کے طلوعِ آفتاب کا وقت نہ ہو جائے۔ سارے لوازم ساتھ لے کر چلے تھے۔ لیکن جوش صاحب مغرب سے پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نشست میں کراچی کے بہت سے ممتاز شاعروں نے شرکت کی اور جوش کے چلے جانے کے بعد بھی محفل دیر تک جمی رہی۔ بعد کے زمانے میں عیش ٹونکی صاحب نے ساحل بلگرامی اور عالمگیر قدر کی جگہ لے لی تھی اور جوش صاحب عموماً انہیں کی معیت میں کہیں آتے جاتے تھے۔ اسلام آباد کی شام کی محفلوں کا حال مجھے معلوم نہیں۔ لیکن کراچی کی بہت سی شامیں، میں نے شاعرِ انقلاب کے ساتھ گزاری ہیں۔ یہ شامیں کیا تھیں؟ ان میں لطائف اور حکایات لذیذ کے ساتھ ساتھ کیسے کیسے ظریفانہ خلاقی کے شاہکار سننے میں آتے تھے انہیں نہ تو قلم بند کیا جاسکتا ہے اور نہ اُن کو سُنانے ہی میں لطف آسکتا ہے یہ شامیں اور ان کی محفلیں سننے کی نہیں صرف دیکھنے اور شریک ہونے کی تھیں۔

Scanned with CamScanner

ضمیمہ نمبر ۱ بسلسلہ بین المملکتی مشاعرہ

جامعہ تعلیم ملی کے منظر و پیش منظر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کے پس منظر سے لوگوں کو صحیح واقفیت نہیں ہے حتیٰ کہ مجلس تعلیم ملی کے سالانہ مطبوعہ روائدادیں بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں اس لئے اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ابتداً اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مجلس تعلیم ملی (رجسٹرڈ) نام ہے ایک انجمن یا تنظیم کا اور جامعہ ملیہ نام ہے اس تعلیمی ادارے کا جو اس مجلس کے تحت قائم ہوا۔ مجلس ملی کی جانب سے سولہ مارچ ۱۹۵۳ء کو جو میمورنڈم چھپا تھا اور جیسے بعض ترمیمات کے ساتھ ٹائمز پریس کراچی سے بھی ۱۹۶۴ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بعض قدیم طلبہ، اساتذہ اور بہی خواہوں کا ایک جلسہ ۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ اسی میں مجلس تعلیم ملی پاکستان کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی تھی، پھر اکیس مارچ ۱۹۴۸ء کو اس کا میمورنڈم مرتب کیا گیا اور مولانا اسلم جیراجپوری، پروفیسر وقار عظیم، سید عروج الحسن، عبدالواحد سندھی، رحیم الدین، تصور حسین اور کے۔ جی چشتی نے اس پر دستخط کیے۔ لیکن یہ مجلس کئی برس تک صرف کاغذ پر رہی اور کوئی عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ جب ماسٹر عبدالحئی مرحوم اور اس وقت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر محمود حسین مرحوم، اس میں عملاً شریک ہوئے تو مجلس تعلیم ملی ایک فعل منتظم بن گئی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قیادت میں ۲۹ اکتوبر ۵۲ء کو "جامعہ ملیہ ملیر" کے نام سے اپنے وجود و اقدام کا عملی ثبوت فراہم کر سکی۔ چنانچہ مجلس تعلیم ملی کا یوم تاسیس اسی نسبت سے ۲۹۔ اکتوبر کو منایا جاتا ہے اس تاریخ کے انتخاب میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد بھی اسی تاریخ کو رکھی گئی تھی۔

"مجلس" کی طرح جامعہ ملیہ کے پس منظر سے بھی عام طور پر لوگ بے خبر ہیں حالانکہ ۹ مارچ ۱۹۵۲ء کے سارے اخبارات اور اپریل ۱۹۵۲ کے نگار کے علاوہ جون ۱۹۶۶ء کے نگار میں بھی اس کا ذکر آ چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں جس وقت مجلس تعلیم ملی کو جامعہ ملیہ کے لئے موجودہ جگہ الاٹ ہوئی تو وہاں چند کمروں کی وہ لمبی بیرک موجود تھی جس میں جامعہ ملیہ کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ یہ

Scanned with CamScanner

گروکل بلڈنگ نام کی ایک متروکہ عمارت تھی اور جامعہ ملیہ سے پہلے اس میں ''ری پبلک اسکول'' کے نام سے آٹھویں جماعت تک ایک اسکول ۱۹۵۰ سے قائم تھا۔ طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی چھ استاد تھے پہلے ہیڈ ماسٹر مقبول احمد مرحوم اور دوسرے ہیڈ ماسٹر ذاکر حسین صدالکھنوی تھے یہ اسکول ''انجمن تعلیمات ملیر'' (رجسٹرڈ) کے تحت قائم تھا اور انجمن کے صدر ملک کے ممتاز صنعت کار اور علم دوست جناب پیر محفوظ علی صاحب تھے۔ اس کی مجلس منتظمہ میں مولانا سعید الرحمٰن رہبر کانپوری، سید رشید احمد رومی، عبدالعزیز جعفری اور ریاض الحق وغیرہ کے ساتھ راقم الحروف بھی شعبہ نشر و اشاعت کے انچارج، رکن کی حیثیت سے شامل تھا۔ نظامت تعلیم کی طرف سے اسکول کے معائنے بھی ہوئے لیکن چونکہ اسکول کی عمارت کے دو کمروں میں مولانا رضی صاحب مع خاندان رہتے تھے اور کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے اس لئے نہ تو پوری عمارت انجمن کی تحویل میں آسکی اور نہ اسکول کو سرکاری امداد مل سکی۔ مالی خستگی کو دور کرنے کیلئے یہ طے پایا کہ ایک بین الملکتی مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ اس مشاعرے کا کنوینز اور اس کی انتظامی کمیٹی کا سیکرٹری بھی راقم الحروف تھا۔ آٹھ مارچ ۱۹۵۲ء کو سندھ مدرسہ کے احاطے میں مشاعرہ ہوا۔ میری گزارش پر علامہ نیاز فتح پوری مرحوم صدارت کیلئے اور جوش، فراق، جگر، اثر لکھنوی اور شعری بھوپالی مہمان شاعر کی حیثیت سے ہندوستان سے تشریف لائے حفیظ جالندھری صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے باہر سے آنے والے شعراء کا خیر مقدم کیا اور ضیاء الحسن موسوی صاحب نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک غیر معمولی مشاعرہ تھا۔ اس میں اس وقت کے بیشتر مرکزی وزراء شریک ہوئے تھے۔ سید ہاشم رضا صاحب کراچی کے ناظم اعلیٰ تھے اور ہندوستانی شعراء کیلئے اجازت نامے انہیں سے حاصل کئے گئے تھے۔ دوسرا دن شعراء کے اعزاز میں پیر محفوظ صاحب نے اپنے گھر میں جو عشائیہ دیا تھا اس میں بھی سید ہاشم رضا صاحب، حفیظ جالندھری صاحب اور ذوالفقار علی بخاری صاحب شریک تھے۔ لیکن مشاعرہ جس غرض سے کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب مرحوم وزیر تعلیم تھے اور جامعہ ملیہ کے

قیام کیلئے جگہ کی تلاش میں تھے، ہاشم رضا صاحب کے توسط سے انہوں نے انجمن تعلیمات ملیر کے صدر پیر محفوظ علی صاحب سے بات چیت کی اور اس خیال سے کہ ملیر میں بہت جلد ایک مثالی تعلیمی ادارہ قائم ہو جائے گا، پیر محفوظ صاحب نے ری پبلک اسکول کی عمارت کو مجلس تعلیم ملی کی تحویل میں دے دیا۔ بعد کو مولانا رضی نے بھی کمرے خالی کر دیئے اور مجلس نے ۲۹ اکتوبر ۵۲ء سے اپنے انداز پر کام کرنا شروع کر دیا۔

ضمیمہ نمبر ۲ بسلسلہ بین المملکتی مشاعرہ

جوش صاحب پہلی بار راقم الحروف کی دعوت پر مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک بین المملکتی مشاعرے کی صدارت کرنے کراچی آئے۔ یہ مشاعرہ چونکہ پاکستان کے مشاعروں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اجمالی ذکر غیر مناسب نہ ہوگ۔ ملیر میں ''انجمن تعلیمات'' نامی ایک رجسٹرڈ سوسائٹی تھی جس کے شعبہ نشر و اشاعت کا کام میرے سپرد تھا۔ اس انجمن کی زیرِ نگرانی ''ری پبلک اسکول'' نامی ایک ثانوی مدرسہ ۱۹۵۰ء سے قائم تھا۔ اس میں مارچ ۵۲ء میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ تھے۔ اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقبول احمد صاحب مرحوم اور دوسرے ہیڈ ماسٹر ذاکر حسین صدالکھنوی تھے۔ مالی مشکلات کی بناء پر جب اسکول کا جاری رکھنا انجمن کیلئے مشکل ہوگیا تو کراچی کے ممتاز صنعت کار و علم دوست جناب پیر محفوظ علی صاحب جو کہ اس انجمن کے صدر تھے کی وساطت سے جامعہ تعلیم ملیؒ کے قیام کیلئے ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے حوالے کر دیا گیا اسی ری پبلک اسکول کی مالی امداد کی غرض سے ایک بین المملکتی مشاعرہ کی تجویز ہوئی اور انجمن نے شعراء کو مدعو کرنے کی ذمہ داری میرے سر ڈالی۔ طے پایا کہ پاکستان کے ممتاز شعراء کے علاوہ ہندوستان سے جوشؔ، فراقؔ، اثرؔ، جگرؔ، سردار جعفریؔ، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، نشور واحدیؔ، ساغر اور شعری بھوپالی کو بُلایا جائے اور مشاعرے کی صدارت بھی کسی وزیر یا سفیر کے بجائے کسی صاحبِ علم و ادب سے کرائی جائے۔ چنانچہ میں نے آل احمد سرورؔ اور احتشام حسین میں سے کسی کو صدارت کیلئے بُلانا چاہا۔ سرورؔ صاحب کا کوئی جواب مجھے نہیں ملا۔ احتشام صاحب نے البتہ مجھے لکھا:

Scanned with CamScanner

''اس وقت میں اتنا طویل سفر اختیار نہیں کر سکتا کچھ ایسی مصروفیات ہیں جن سے چھٹکارا فی الحال حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری معذرت شاعرانہ نہیں واقعی ہے''۔

بعد ازاں نیاز صاحب کو لکھا گیا نیاز صاحب نے جواب میں لکھا کہ ''میں فروری میں نہیں مارچ کے پہلے ہفتہ میں آ سکتا ہوں''۔ چنانچہ ۸ مارچ ۵۲ء مشاعرے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ مجاز، سردار جعفری اور مجروح کو اجازت نامے نہ مل سکے۔ بعض شعراء نجی ضرورتوں کے تحت معذور رہے۔ فراقؔ، جوشؔ، آثرؔ اور شعری بھوپالی کے آنے کے امکانات البتہ پیدا ہو گئے۔ یہ بات بھی اس جگہ قابلِ ذکر ہے کہ ان بزرگوں نے مشاعرے میں شرکت کیلئے کسی زرِ پیشگی معاوضے کا مطالبہ نہ کیا تھا۔ میں نے اپنے طور پہلے ہی خط میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ''انجمن'' مالی خستگی کی بناء پر سر دست سفر خرچ کے کچھ اور پیش نہ کر سکے گی۔ ہاں مشاعرے کے بعد اگر انجمن میں جان پیدا ہو گئی تو وہ ان کی ممکن خدمت سے دریغ نہ کرے گی''۔

نیازؔ، آثرؔ، جوشؔ، فراقؔ اور شعری بھوپالی سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ اور شاید اسی لئے انہوں نے میری دلشکنی کسی طرح گوارا نہیں کی اور مشاعرے میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ جوش صاحب نے البتہ یہ لکھا کہ وہ ہزار ڈیڑھ ہزار پیشگی لئے بغیر نہ آ سکیں گے۔ انہوں نے اپنے خط میں بھی اسی قسم کا اظہارِ خیال کیا لیکن بعد کو میری عاجزانہ تحریر نے خدا جانے ان پر کیا اثر کیا کہ انہوں نے مجھے لکھا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ راجستھان سرکار سے، جس کی سعی کر رہا ہوں۔ اگر پچھلے الاؤنس کی چڑھی ہوئی رقم آ گئی تو میں ذاتی مصارف سے کراچی پہنچ جاؤں گا اور میں پہنچ سکا تو مجھے اس خیال سے روحانی مسرت ہو گی کہ میں نے آپ کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اگر خدانخواستہ رقم وقت پر نہ ملی تو یقین فرمایئے کہ مجھے آپ سے کم اس کا ملال نہیں ہو گا کہ میں آپ کی دعوت قبول کرنے کی مسرت سے محروم رہا''۔

پھر بھی خدا جانے کیوں میں ہندوستان سے آنے والے ان بزرگوں کی طرف سے

Scanned with CamScanner

زیادہ مطمئن نہ تھا۔ اول اس لئے کہ اس وقت ہندوستان و پاکستان کے سیاسی روابط کچھ ایسے تھے کہ کسی کا اجازت نامہ کسی بھی وقت منسوخ ہوسکتا تھا۔ دوسرے ان میں سے بعض کے متعلق خصوصاً جوشؔ اور فراقؔ کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بڑی پیشگی رقم کے بغیر اس قسم کے مشاعروں میں شرکت ہی نہیں کر سکتے خواہ کتنے ہی پختہ وعدے کیوں نہ کرلیں''۔ اس وقت کراچی میں میرا حلقہ احباب کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ وسائل و ذرائع محدود تھے ذمہ داری بہت بڑی تھی سب لوگ یہ کہہ کر خوف زدہ کرتے تھے کہ ''جن حضرات کے نام اخبار اور اشتہار میں شائع ہوئے ہیں ان میں سے کوئی آنے والا نہیں''۔ یہ خیال غلط نہ تھا اس لئے کہ کراچی کے ہر بڑے مشاعرے کے سلسلے میں ان حضرات کے نام اشتہاروں میں سرفہرست دیئے جاتے اور یہ مشاعرے میں کبھی نظر نہ آتے تھے۔

اسی اُلجھن میں ان حضرات کی روانگی سے قبل کی شام کو میں نے انڈین ایئر لائن دلی کو ٹرنک کال کر کے معلوم کیا کہ جن لوگوں کی سیٹیں بک کرائی گئی ہیں ان میں سے کس کس نے ٹکٹ حاصل کر لئے ہیں؟ جواب ملا کہ جوشؔ صاحب کے سواء سب ہی ٹکٹ حاصل کر چکے ہیں۔ اس خیال سے کہ ٹکٹ کر رقم ضائع نہ ہو۔ میں نے جوشؔ صاحب کی سیٹ منسوخ کرادی۔ اب میرے مہمانوں میں صرف نیازؔ، فراقؔ، اثرؔ اور شعریؔ تھے۔ لیکن ایئر پورٹ پہنچنے پر جب میں نے یہ دیکھا کہ جوشؔ صاحب بھی جہاز سے اُترے چلے آرہے ہیں تو میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس دن سے میں جوشؔ صاحب کو بطور انسان کے بھی بڑا سمجھنے لگا۔

یہ حضرات ۶ مارچ ۱۹۵۲ء جمعہ ۱۱ بجے دن کو کراچی پہنچے، اثرؔ صاحب کے رہنے کا انتظام میں نے ایک دوست مرزا تصدق بیگ کے یہاں کردیا نیازؔ صاحب نے اپنے برادرِ نسبتی کے ساتھ ٹھٹائی کمپاؤنڈ میں قیام کرنا پسند کیا۔ جوشؔ، فراقؔ اور شعریؔ کو برسٹل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ جگر صاحب پہلے ہی سے کراچی میں مقیم تھے۔ لیکن لاہور گئے ہوئے تھے۔ میں نے لاہور کے پتے پر اُنہیں مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تھی لیکن جواب نہیں آیا۔ ہماری انجمن کے ایک رکن اور

Scanned with CamScanner

اپنے دیرینہ دوست مولانا سعید الرحمٰن رہبر صاحب کو انہوں نے لکھا کہ میں ایک دن پہلے کراچی پہنچ جاؤں گا اور وہیں باتیں کرلوں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ جگر صاحب مشاعرے سے ایک دن پہلے کراچی پہنچ گئے۔ میں رہبر صاحب کی رہبری میں جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور مشاعرے میں شرکت کرنے کی گزارش کی۔ جگر صاحب نے پوچھا کہ ہندوستان سے کون کون آیا ہے؟ میں نے نام بتائے، نیاز صاحب کا نام سُن کر بولے آپ کو اس دہریئے کے سوا اور کوئی صدارت کیلئے نہیں ملا؟ میں اس کی صدارت میں نہیں پڑھوں گا''۔ ہماری دعوت پر یہ ان کا اولین ردِعمل تھا لیکن جب ہم نے خوشامد برآمد سے کام لیا اور سمجھایا کہ نیاز صاحب کی دہریت سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے ہم نے تو ایک ادیب کی حیثیت سے اُنہیں بُلایا ہے تو جگر صاحب کچھ نرم ہوئے اور بولے۔ اچھا بتایئے نیازؔ، جوشؔ اور فراقؔ نے کیا لیا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ اثر صاحب اور نیاز صاحب سفر خرچ کے سوا اور کچھ نہ لیں گے۔ دوسرے شعراء بھی سرِ دست سفر خرچ پر تشریف لا رہے ہیں۔ لیکن فراقؔ صاحب اور جوشؔ صاحب بغیر تنخواہ کی رخصت پر آرہے ہیں اس لئے اگر ممکن ہوا تو سفر خرچ کے علاوہ بھی انہیں زیادہ سے زیادہ پانچ پانچ سو روپے دیئے جائیں گے۔ جگر صاحب نے کہا ایسا ممکن نہیں۔ ان میں سے کوئی شاعر بھی سفرِ خرچ کے ساتھ ہزار ڈیڑھ ہزار لئے بغیر اپنی جگہ سے ہلنے کا نہیں۔

ہم نے جگر صاحب کو بڑے عاجزانہ لہجے میں انجمن کی مالی مشکلات سے آگاہ کرنا چاہا۔ فتحپور کے سالانہ مشاعروں کے حوالوں سے انہیں یاد دلایا کہ آپ ان مشاعروں میں غیر مشروط، بلکہ اپنے ذاتی مصارف سے شرکت فرماتے تھے۔ کہنے لگے یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن یہاں کا معاملہ دوسرا ہے۔ میں اتنی ہی رقم لوں گا جتنی نیازؔ، اثرؔ جوشؔ اور فراقؔ وغرہ نے لی ہے۔ ساتھ ہوائی جہاز کا واپسی سفر خرچ بھی لوں گا۔ اس لئے کہ اگر میں ہندوستان میں ہوتا آپ بہر حال مجھے بلاتے''۔ میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا جس قدر جگر صاحب کو یقین دلایا جاتا کہ ان لوگوں کو کچھ نہیں دیا۔ اسی قدر جگر صاحب برہم ہو جاتے اور جب ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہ کہا تو انہوں

Scanned with CamScanner

نے آخر میں خود فیصلہ دے دیا کہ میں ایک ہزار اور سفر خرچ لینے کے بعد مشاعرے میں شرکت کروں گا۔ ہم بہت مایوس ہوئے یہ بات تقریباً ۴ بجے اس دن ہوئی جس دن مشاعرہ ہونے کو تھا۔ اس طرف شہر میں یہ خبر عام ہوگئی کہ جگر صاحب نے نیازؔ کی صدارت کی وجہ سے مشاعرے میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب نے اپنے دوستوں کو یہی باور کرایا اس لئے کہ جب دوبارہ تقریباً ساڑے چھ بجے جگر صاحب کے پاس گئے تو اس بار جگر صاحب نے نیاز کی صدارت پر بھی اعتراض کئے اور فرمانے لگے: آپ کو اس دہریئے کے سوا اور کوئی نہیں ملا۔ بہرحال جگر صاحب سے مل کر میں مدرسہ واپس آگیا اور مشاعرے کے انتظام میں لگ گیا تقریباً ۸ بجے یعنی مشاعرے کے عین آغاز کے وقت سعید الرحمٰن رہبر صاحب آئے اور کہنے لگے کہ میں نے جگر کو صرف پانچ سو روپے میں راضی کرلیا ہے بشرطیکہ یہ رقم انہیں مشاعرے سے پہلے دے دی جائے۔

اس وقت اس رقم کا فراہم کرنا آسان نہ تھا لیکن چونکہ میں ذاتی طور پر جگر صاحب کا دلدادہ تھا اور مشاعرے میں ان کی شرکت کو اہم اور ضروری خیال کرتا تھا اس لئے کسی طرح سے پانچ سو روپے جگر صاحب کو بھجوا دیئے گئے اس طرح جگر صاحب کی شرکت مشاعرے میں یقینی ہوگئی۔

ساڑھے ۸ بجے شب سے مشاعرہ ہونے کو تھا۔ اس سے چند منٹ پہلے میں نیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور مشاعرہ گاہ چلنے کی درخواست کی۔ نیاز صاحب نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ جگر صاحب میری صدارت کی وجہ سے شرکت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ مجھے مشاعرے میں نہ لے جایئے اس لئے کہ مشاعرے کو جتنی ضرورت جگر کی ہے میری نہیں ہے چونکہ نیاز صاحب کے ساتھ اور بہت سے لوگ تھے جن سے میں واقف نہ تھا اور دوسرے یہ کہ وہ لمحات بڑی عجلت کے تھے اس لئے میں نے اصل واقعہ بتانے کے بجائے بات ٹال دی اور نیاز صاحب کو لے کر سندھ مدرسہ پہنچا۔ وہاں میں نے نیاز صاحب کی خدمت میں مشاعرے کا

Scanned with CamScanner

پروگرام اور شعراء کی فہرست بھی پیش کی۔ فہرست میں سب سے پہلا نام شمیم جاوید کا تھا۔ آخری ناموں کی فہرست یوں تھی: جگر، اثر، جوش اور فراق۔ نیاز صاحب نے فہرست پر نظر ڈالی اور آخری ناموں کو الٹ پلٹ کر جگر صاحب کو سب سے آخر میں کر دیا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ ممکن ہے جگر صاحب یہ محسوس کرتے یہ میری وجہ سے ہوا اس لئے ان کا آخر ہی میں پڑھنا مناسب ہے۔ میں چپ ہوگیا۔ ساڑھے ۸ بجے مشاعرے کے آغاز کا اعلان ہوا۔ نیاز صاحب نے ''سرزمینِ سندھ کا ایک رومان'' کے عنوان سے بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ سامعین پورے ۳۰ منٹ اس معلومات افزاء خطبے سے محظوظ ہوئے۔ یہ خطبہ دانشکدہ کراچی سے کتابچہ کی صورت میں بعد کو شائع کر دیا گیا۔ اس موقع پر رئیس امروہوی صاحب نے ہفت روزہ شیراز کا نیاز نمبر شائع کیا اور اس میں نیاز صاحب پر متعدد مقالات، نظمیں اور تصویریں شائع کی گئیں۔

جوش صاحب، فراق صاحب، اثر صاحب اور شعری صاحب تین چار دن ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ نیاز صاحب کی ایک بہن، دو لڑکیاں، خسر، خوشدامن، ہمزلف، برادر نسبتی، دولڑکے اور بہت سے قریبی عزیز چونکہ پاکستان ہی میں تھے اس لئے وہ تقریباً تین ہفتے کراچی میں رہے اور ۳ اپریل ۵۲ء کو لکھنؤ واپس پہنچ گئے۔ نیاز صاحب کو چونکہ پاکستان آنے کا اجازت نامہ ہندوستانی حکومت نے خاص شرائط کے ساتھ دیا تھا اس لئے انہوں نے کراچی کے دو اور ادبی جلسوں میں شرکت سے گریز کیا۔ اس زمانے کا ایک لطیفہ مجھے یاد آیا۔ جس دن نیاز صاحب کراچی پہنچے اس کے دوسرے دن دیوان سنگھ مفتوں مدیر ریاست دہلی کا ایک ایکسپریس ٹیلی گرام ہندوستانی سفارت خانے کے ذریعے نیاز صاحب کے پاس آیا جس میں لکھا تھا۔

Most important and delicate matter involved Reach Dehli at once

نیاز صاحب سخت پریشان ہوئے انہیں بڑی دقتوں کے بعد پاکستان آنے کی اجازت ملی تھی۔ ایک بچے کو بیمار چھوڑ کر آئے تھے۔ تار پاکر فوراً واپسی کا ارادہ کرنے لگے میں عجیب الجھن

Scanned with CamScanner

میں گرفتار ہوا طے پایا کہ دیوان سنگھ مفتوں کو ٹرنک کال کر کے واقعہ کی تفصیل پوچھی جائے۔ ہندوستانی سفارتخانے کو صورتِ حال کی نزاکت بتائی گئی اور کسی طرح سے دیوان سنگھ کا ٹیلی فون نمبر حاصل کیا گیا دوسری دن صبح بہ مشکل ٹرنک کال کی نوبت آئی دیوان سنگھ نے نیاز صاحب کو بتایا کہ ''ان کا داماد قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہوگیا ہے دلی کے ڈپٹی کمشنر آپ کے دوست ہیں فوراً آیئے اور سفارش کیجئے۔ نیاز صاحب نے ''اچھا'' کہ کر ٹیلی فون رکھ دیا۔ کبھی ہنستے کبھی جھنجلاتے کہنے لگے ''سردار جی کے متعلق جو لطیفے مشہور ہیں وہ بے بنیاد نہیں''۔

Scanned with CamScanner

جوش ملیح آبادی کے مختصر سوانحی کوائف

جوش ملیح آبادی کا نام سنتے ہی بعض لوگ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ ملیح آباد کہاں ہے اور برعظیم پاک وہند میں اس کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت کس نوع کی ہے، تاریخی حیثیت کی تفصیل اکثر کتابوں میں مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں، علم وادب کے حوالے سے ملیح آباد میں دو بڑی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں دونوں کے حالات میں ملیح آباد کی بہت سی تاریخ وجغرافیائی تفصیل مل جاتی ہے۔ میری مراد عبدالرزاق ملیح آبادی اور جوش ملیح آبادی ہے دونوں معاصر ہیں اور نامور اہل قلم ہیں۔ ایک شاعری کے حوالے سے دوسرا صحافت وتاریخی وسیاست کے حوالے سے۔ جوش نے خود نوشت ''یادوں کی بارات'' میں ملیح آباد کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر ڈاکٹر سنجر ہلال نے تحقیقی کام کر کے کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی ہے۔ اس مقالے میں بھی انہوں نے ملیح آباد کا حال خاصی تفصیل سے لکھ دیا ہے پھر بھی چونکہ ملیح آباد کی یہ تفصیل عام قاری کی دسترس میں نہیں ہے اس لئے جوش ملیح آبادی کے ذکر میں ملیح آباد کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

ملیح آباد، لکھنو (یوپی) کا ایک مردم خیز تاریخی قصبہ ہے، دریائے گنگا کے ذریعے سفر کریں تو دہلی سے مغرب کو کلکتے کی طرف چلیں تو دوآبہ کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد گنگا کے دائیں طرف کانپور، فتح پور اور الٰہ آباد کے اضلاع ملیں گے جبکہ بائیں طرف لکھنؤ، رائے بریلی، اناؤ، سلطان پور اور پرتاب گڑھ کے اضلاع کی سرحدوں سے گزرنا ہوگا۔ لکھنؤ کے سوا یہ اضلاع اگرچہ چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن ان کے بعض قصبات مثلاً ملیح آباد، سندیلہ، صفی پور، موہان، کاکوری اور کسمنڈی وغیرہ شعر وادب اور تاریخ وثقافت کے حوالے سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ مذکورہ بالا اضلاع اور شہر دراصل انہی قصبات کے وسیلے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان قصبات میں بھی ملیح آباد کو ایک نہایت ممتاز ومنفرد مقام حاصل ہے اور یہ مقام حقیقتاً جوش ملیح آبادی کے نام اور کام سے اس کو میسر آیا ہے۔

جوش کا آبائی وطن ملیح آباد ہے اور اس کے تعلق سے ان کے سوانحی کوائف کچھ اس طور پر ہیں۔

Scanned with CamScanner

خاندانی تفصیل

خاندانی نام	:	شبیر احمد خاں
خود اختیار کردہ نام	:	شبیر حسن خاں (۱۹۰۷ء)
تاریخ وسال پیدائش	:	۵/ دسمبر ۱۸۹۸ء
جائے پیدائش	:	ملیح آباد، لکھنؤ، یوپی
ابتدائی تخلص	:	شبیرؔ
تبدیل شدہ تخلص	:	جوشؔ
وفات	:	۲۲/ فروری ۱۹۸۲ء
مدفن	:	اسلام آباد
والد کا نام	:	نواب بشیر احمد خاں بشیر
والدہ کا نام	:	بسم اللہ بیگم
دادا	:	نواب محمد احمد خاں احمد
پردادا	:	نواب فقیر محمد خاں گویا
بھائی:		ا۔ شفیع احمد خاں ولی
		۲۔ رئیس احمد خاں رئیس
بہن	:	ا۔ افسر جہاں بیگم
		۲۔ انیس جہاں بیگم
		۳۔ حشمت جہاں بیگم
		۴۔ شوکت جہاں بیگم

غیر رسمی تعلیم اور اساتذہ

عربی	:	مرزا ہادی رسوا

Scanned with CamScanner

فارسی، اردو	:	مولانا قدرت اللہ بیگ ملیح آبادی
		مولوی نیاز علی خاں ملیح آبادی
		مولانا ظاہر
انگریزی	:	ماسٹر گومتی پرشاد ملیح آبادی

رسمی تعلیم اور ادارے

سیتاپور اسکول، یو پی

حسین آباد ہائی اسکول، لکھنؤ

جوبلی ہائی اسکول، لکھنؤ

سینیٹل ہائی اسکول، لکھنؤ

چرچ مشن ہائی اسکول، لکھنؤ

ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ

سینٹ پیٹرس کالج، آگرہ

شانتی نکیتن

شادی و نکاح

نکاح	:	۱۹۰۷ء
رخصتی	:	۱۹۶۱ء
بیگم	:	اشرف جہاں

اولاد

بیٹی	:	سعیدہ خاتون
بیٹا	:	سجاد حیدر

Scanned with CamScanner

سلسلہ ملازمت ومشاغل

۱۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے وابستگی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۴ء

۲۔ ترقی اردو بورڈ کراچی جون ۱۹۵۸ء تا ۱۹۵۹ء

ادارت

ماہنامہ کلیم دہلی ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء

ماہنامہ نیا ادب لکھنؤ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۱ء

ماہنامہ کلیم لکھنؤ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۱ء

ماہنامہ آج کل، دہلی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء

آغاز شاعری اور تلمذ

تلمذ : عزیز لکھنوی

پہلا شعر بعمر ۹ سال : ۱۹۰۷ء

پہلی نظم : ہلال محرم، بعمر ۱۱ سال، ۱۹۱۴ء

نظم ونثر کا پہلا مجموعہ : روح ادب ۱۹۲۱ء، بمبئی

فلمی دنیا سے وابستگی : شالیمار پکچرز، پونا، بمبئی ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء

القاب

شاعر انقلاب

شاعر شباب

خطاب شاعر اعظم

پدما بھوشن (حکومت ہند)

Scanned with CamScanner

تخلیقات

روح ادب	۱۹۲۱ء	کتب خانہ تاج آفس بمبئی
آوازۂ حق	۱۹۲۱ء	اصح المطابع، لکھنؤ
شاعر کی راتیں	۱۹۳۰ء	نگارستان بک ایجنسی، دہلی
نقش ونگار	۱۹۳۶ء	مکتبہ جامعہ، دہلی
شعلہ وشبنم	۱۹۳۶ء	مکتبہ جامعہ، دہلی
فکر نشاط	۱۹۳۷ء	کلیم بک ڈپو، دہلی
جنون وحکمت	۱۹۳۷ء	کلیم بک ڈپو، دہلی
حرف وحکایت	۱۹۳۸ء	کتب خانہ تاج آفس، بمبئی
پیغمبر اسلام	۱۹۴۰ء	صدیق بک ڈپو، لکھنؤ
آیات ونغمات	۱۹۴۱ء	مکتبہ اردو، لاہور
عرش وفرش	۱۹۴۴ء	کتب خانہ تاج آفس، بمبئی
رامش ورنگ	۱۹۴۵ء	قومی ادارہ الاشاعت، بمبئی
سنبل وسلاسل	۱۹۴۷ء	کتب خانہ تاج آفس، بمبئی
سیف وسبو	۱۹۴۷ء	مکتبہ اردو لاہور/بمبئی
سرود وخروش	۱۹۵۳ء	منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی
سموم وصبا	۱۹۵۵ء	منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی
طلوع فکر	۱۹۵۷ء	احمد۔ اے۔ جی۔ وا جی، کراچی
موجد ومفکر		نامی پریس، لکھنؤ
الہام وافکار	۱۹۶۶ء	جوش اکاڈمی، کراچی
نجوم وجواہر	۱۹۶۷ء	جوش اکاڈمی، کراچی
محراب ومضراب	۱۹۹۳ء	جنگ پبلشرز، لاہور

غیر مطبوعہ

حرف آخر (طویل نظم) جس کی تکمیل نہ ہو سکی البتہ اس کے بعض اجزاء مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

نثری مجموعے

مقالاتِ زریں	:	۱۹۲۱ء	لکھنؤ
اشارات	:	۱۹۴۲ء	دہلی
یادوں کی بارات (خودنوشت)		۱۹۷۰ء	طبع اول، جوش اکیڈمی، ۶/۳۔ا کبر روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۷۳۰۲، کراچی نمبر ۳

Scanned with CamScanner

میری پسند

پانچ نظمیں

۱۔ شمعِ ہدایت

۲۔ جنگل کی شہزادی

۳۔ تلاشی

۴۔ ماتم آزادی

۵۔ گُل بدنی

Scanned with CamScanner

شمع ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری
خشک عرب کی ریگ سے لہر اٹھی نیاز کی
قلزمِ نازِ حُسن میں اف رے تری شناوری
اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا، نازشِ مہرِ خاوری
اے کہ ترے بیان میں نغمۂ و آشتی
اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری
اے کہ ترے دماغ پر جنبشِ پرتوِ صفاء
اے کہ ترے خمیر میں کاوشِ نور گستری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری
تیرے قدم پہ جبّہ سا روم و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خودسری
تیرے سخن سے دب گئے لاف و گزاف کفر کے
تیری نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری

لحن سے تیرے منتظم پست و بلندِ کائنات

ساز سے تیرے منضبط گردش چرخِ چنبری

چینِ ستم سے بے خبر تیری جبینِ دل کشی

حرفِ وفا سے تاب ناک تیری بیاضِ دلبری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے

بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری

بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر رشکِ خضر بنا دیا

راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری

سلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی

پگھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری

چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی

نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتح خیبری

زمزہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا

صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روح بوذریؓ

آئینہ ترے خُلق کا طبعِ حسنؓ کی سادگی

جذبہ تیرے عرود کا آلِ عبا کی برتری

جھلکیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکُلِ حسینؓ

رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفریؓ

شان تیرے ثبات کی عزمِ شہید کربلا

شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدریؓ

Scanned with CamScanner

رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرِ قتیل

نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغری

تیرا لباسِ فاخرہ چادرِ کہنۂ بتولؓ

تیرے غذائے خوش مزا نانِ شیر حیدریؓ

تجھ پہ نثار جان و دل مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے

دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری!

تیرے گدائے بے نوا، تیرے حضور آئے ہیں

چہروں پہ رنگِ خستگی سینوں میں دردِ بے پری

آج ہوائے دہر سے اُن کے سروں پہ خاک ہے

رکھی تھی جن کے فرق پر تو نے کُلاہِ سروری

تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا

تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری

طرفِ کُلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹکے ہوئے

حیف اب ان سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری

جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں

اب نہ وہ تیغِ غزنوی، اب نہ وہ تاجِ اکبری

اُٹھ کر ترے دیار میں پرچمِ کُفر کُھل گیا

دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

خیز و دلِ شکستہ را، دولتِ سوز و ساز دہ

مسلمِ خستہ حال را، رخصتِ ترکتاز دہ

جنگل کی شہزادی

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں　　اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جارہا تھا　　اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا
تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جارہی تھی　　لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی
خورشید چُھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں　　طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دُور پر تھا پانی، مُوجیں رُکی ہوئی تھیں　　تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئیں تھیں
لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا　　میں سو رہا ہوں، ایسا محسوس ہو رہا تھا
اک موج کیف پرور دل سے گزر رہی تھی　　ہر چیز دلبری سے یُوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے　　دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب، گل رُخ، کافر دراز مژگاں　　سیمیں بدن پَری رُخ، نوخیز حشر ساماں
خوش چشم خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر　　نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر
کافر ادا، شگفتہ، گُل پیرہن، سمن بو　　سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو
گیسو کمند، مہوش، کافور فام قاتل　　نظارہ سوز، دل کش سرمست، شمعِ محفل

Scanned with CamScanner

ابرو ہلال ے گوں جاں بخش روح پَرور نسرین بدن پَری رُخ، سیمیں عذار، دلبر

آہو نگاہ، نورس، گل گوں، بہشت سیما یاقوت لَب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

غارت گرِ، تحمّل، دل سوز، دشمنِ جاں پروردَہ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

گلشن فروغ، کم سنِ، مخمور ماہ پارا دلبر کہ درکفِ او موم است سنگ خارا

ہر بات ایک افسوں، ہر سانس میں ایک جادو قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نُور دیدہ برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ

چہرے پہ رنگِ تمکیں آنکھوں میں بیقراری ایمائے، سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری

لوہا تپانے والی جلووں کی ضو فشانی سکے بٹھانے والی، اُٹھتی ہوئی جوانی

ڈوبے ہوئے سب اعضا حُسنِ مناسبت میں پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں

حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

حُوریں ہزار دل سے قربان ہوگئی ہیں

رنگینیاں سمٹ کر انسان، ہوگئی ہیں

Scanned with CamScanner

چین ستم گری سے نا آشنا جبیں ہے
میں کون ہوں؟ یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
رہ رہ کے اُڑنے والی چادر سنبھالتی ہے

آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا
غش کھا رہی تھی، عقبیٰ چکرا رہی تھی دُنیا

گاڑی سے پھر اُتر کر اس کے قریب آیا
طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا

اس درسِ آدمیت سے شاعری کی جنّت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

اے رُوحِ، صنفِ نازک، اے شمعِ بزمِ عالم
اے صبحِ روئے خنداں اے شامِ زلفِ برہم

اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
قدرت کی انتہائی تخیلِ دل رُبائی

چشم و چراغ صحرا، اے نورِ دشت و وادی
رنگیں جمال دیوی جنگل کی شاہزادی

بستی میں تو جو آئے، اِک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو

رندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں
تسبیحِ شیخ اُلجھے، توبہ کی عزم ٹوٹیں

Scanned with CamScanner

نظروں سے اتقاء کے رسم و رواج اُتریں　　　زہاد کے عمامے شاہوں کے تاج اُتریں

آنکھیں ہوں اشک افشاں نالے شرر فشاں ہوں　　　کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں

شہروں کے مہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے　　　پروردۂ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے

اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آئیں　　　جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں

تیری ادا کے آگے شرما کے مُنہ چھپائیں　　　ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں

تیری نظر کی رو سے ہوجائیں خستہ و گُم　　　مشق و مزا ولت کے پالے ہوئے تبسم

امن واماں کے رُخ کو بے آب و رنگ کر دے　　　دنیا کو حُسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے　　　خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چبھتے ہوئے فسانے
ان انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پُجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا　　　اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بن، یہ گل، یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے　　　شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے

کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟　　　اے زمزموں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے

بجنے لگیں وَفا کی محفل میں شادیانے　　　ہاں دے بسوں کو جنبش اے سَرمدی ترانے

یوں چُپ سے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے　　　یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

Scanned with CamScanner

سُننا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دُہائی!

عشوہ جبیں پہ لے کر دل کی اُمنگ آیا   چہرے پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پر ہاتھ پھیرا   اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا
چمکا دیا حیا نے ہر نقشِ دل بَری کو   دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو
سُن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں   اس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئیں زبانیں
شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہاتھ پھیرا   دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا
کچھ جسم کو چُرایا، کچھ سانس کو سنبھالا   کاندھے پر نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا
تاریک کر کے میری آنکھوں میں اک زمانہ   جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ
ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جُھکایا   دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا
بے ہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی   اتنے میں رات لے کر قندیلِ ماہ نکلی

مُڑ کر جو میں نے دیکھا، اُمید مَر چکی تھی
پڑی چمک رہی تھی گاڑی گزر چکی تھی

Scanned with CamScanner

تلاشی

جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے ان میز کے خانوں میں ہے

بند پانی میں سفینہ کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد!
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مُراد

جس کے اندر دہشتیں پُرہول طوفانوں کی ہیں
لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمنِ ہندوستاں!
شیر جس کے ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں

چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی

جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
نارِ دوزخ کو پسینہ جس سے آجائے وہ آگ

موت جس میں دیکھتی ہے مُنہ اُس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے میرے سینے کو دیکھ!

Scanned with CamScanner

ماتمِ آزادی

اے ہم نشیں! فسانۂ ہندوستان نہ پوچھ   رُودادِ جَامِ بخششِ پیرِ مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ   کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

کیا کیا نہ گُل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

شاخیں ہوئیں دو نیم جو ٹھنڈی ہَوا چلی   گم ہوگئی شمیم جو بادِ صَبا چلی
انگریز نے وہ چال بہ جور و جفا چلی   بَرپا ہوئی برات کے گھر میں چلا چلی

خونِ چمن بَہار کے آتے ہی بہہ گیا
اُترا جو طوق اور بھی دَم گھٹ کے رہ گیا

جُھومی گھٹا، فضا شرر آمیز ہوگئی   کھولی خوشی نے زلفِ غم انگیز ہوگئی
مچلی نسیمِ عقل، جنوں خیز ہوگئی   سائے میں دھوپ اور بھی کچھ تیز ہوگئی

پارا، چلی تو سرد ہوائیں تو چڑھ گیا
درماں ہوا تو دردِ جگر اور بڑھ گیا

اِک دل نشیں کلی جو سرِ باغ کِھل گئی   تو خاک میں لطافتِ گلزار مل گئی
پہنی قبائے نرم تو جلد اور چِھل گئی   ٹھہرا جو دل تو صبر کی بنیاد ہل گئی

شبنم اُدھر گہر، وَرقِ گُل پہ جڑ گئی
گلزارِ زندگی پہ اِدھر اُوس پڑ گئی

Scanned with CamScanner

باجے بجے تو شورِ فغاں دُور تک گیا کشتی ملی، تو خیر سے دریا بچک گیا
شبنم گری دل سمن و سَرو پک گیا بُوندیں پڑیں تو اور بھی گلشن دَندک گیا

اپنا گلا خروشِ ترنم سے پھٹ گیا
تلوار سے بچا تو رگِ گُل سے کٹ گیا

دولت ملی تو اور بھی نادار ہوگئے صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہوگئے
اُترا تو بار، اور گراں بار ہوگئے آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہوگئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں سنگ ہوگئی
بُو یوں پھٹی کے صبحِ چمن دنگ ہوگئی

باطل ہوا جو خوف تو دل اور ڈر گیا بھکیں مَسیں تو زیست کا منہ اور اُتر گیا
پایا سُبو تو عمر کا پیمانہ بھر گیا پُرساں ہوئے مسیح تو بیمار مر گیا

نغمے چھڑے تو شورشِ پیکار بن گئے
گونجے جو راگ تیغ کی جھنکار بن گئے

چہکے جو اعتماد کے گلزار میں طیُور بے اعتمادیوں کا گیا شور دُور دُور
دوڑا رُخِ فسردہ پہ جب زندگی کا نُور دی موت نے صدا کہ ''نمستے شری حضور''

باقی رہے جگہ نہ کوئی موت کیلئے
لونڈی سمجھا میں آئی ہے ڈنڈوت کیلئے

Scanned with CamScanner

فتنے مٹے تو امن کی دولت نہیں رہی انسان کی وہ قدر وہ قیمت نہیں رہی
حاصل ہوا عروج تو عزت نہیں رہی پائی جو حریت تو حرارت نہیں رہی

جب روزگار نرم ہوا سنگ ہوگئے
وسعت ملی تو اور بھی دل تنگ ہوگئے

چھٹکی جو چاندنی تو بڑی ظلمتوں کی شان بازار جب کھلا تو ہوئی بند ہر دکان
چھیڑے جو راگ سر پہ کڑکنے لگی کمان چھت کی لگی جو ڈاٹ تو شق ہوگیا مکان

دُرماں سے اور دل ہمہ تن درد ہوگیا
پھوٹی کرن تو صبح کا منہ زرد ہوگیا!

شادی ہوئی تو غم کے خزانے لٹا دیئے کچھ یوں دِیئے جلائے کہ دل ہی بجھا دیئے
سہرا بندھا تو شرم کے پردے اُٹھا دیئے مہندی لگی تو خون کے دریا بہا دیئے

دُولہا بنے تو حدِ مسرت سے بڑھ گئے
گھوڑے کے لات مار کے سولی پہ چڑھ گئے

دُکھے تو سوزِ مَوجِ تکلم نہیں رہا چمکے تو لحن و ساز و ترنم نہیں رہا!
مہکے تو رقص و رنگ و تبسم نہیں رہا مہکے تو بُوئے گل کا تلاطم نہیں رہا!

کانپے جو تار دیو محن بولنے لگا
خیمے ہوئے نصیب تو رَن بولنے لگا

Scanned with CamScanner

اُبھرے تو جوشِ بادہ گساراں نہیں رہا   بادل گھرے تو رنگِ بہاراں نہیں رہا
باہیں کھلیں تو رقصِ نگاراں نہیں رہا   بوتل کھلی تو مجمعِ یاراں نہیں رہا

کوئی سبیلِ بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو ہستی نہیں رہی

جب باغبانِ قوم ظفر مند ہوگیا   ہر برگِ بزمِ خاک کا پیوند ہوگیا
عاشق جو وصلِ یار سے خود سند ہوگیا   فالج گرا دماغ پہ دل بند ہوگیا

اُترا بخار عقل کو طاعون ہوگیا
پیدا ہوا لہو تو جگرِ خون ہو گیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر اُدھڑ گئی   بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ جکڑ گئی
بھرنے لگے جو شہر تو بستی اُجڑ گئی   ٹوٹی رسن تو عقل میں زنجیر پڑ گئی

طاقت ملی تو کوئی توانا نہیں رہا
برسا جو مینہ تو کھیت میں دانا نہیں رہا

بارش ہوئی زمین دَندک کر اُبل گئی   اُودی گھٹا اٹھی تو ہری دوب جل گئی
اُبھری حیات، موت کے سانچے میں ڈھل گئی   باہیں پڑیں گلے میں کہ تلوار چل گئی

آبِ بقاء سے زہر کی لہریں اُبل پڑیں
بوسے لے تو منہ سے زبانیں نکل پڑیں

Scanned with CamScanner

دشمن گئے تو دوست بنے دشمنِ وطن   شبنم جو پی تو کھول گئے لالۂ و سمن
سنکی ہوائے سرد تو کِجلا گیا چمن   خلعت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

نغمے چھیڑے تو شور سرِ بام مچ گیا
چٹکی کلی تو باغ میں کہرام مچ گیا

ہر مُوئے زلف اینٹھ گیا، مار بن گیا   ہر مہر کا خطیب، جفا کا رَبن گیا
ہر صبح کا رسول، شبِ تار بن گیا   ہر لوچ اک اُپی ہوئی تلوار بن گیا

بدلی نگاہ طور سے بے طور ہوگئے
ہم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہوگئے

سکھ نے گرو کے نام کو بٹہ لگا دیا   مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا   مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

اک سُوئے ظن کو غلغلۂ عام کر دیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کر دیا!

سِکوں کے انجمن میں خریدار آگئے   سیٹھوں کے خادمانِ وفادار آگئے
کھدر پہن پہن کے بداطوار آگئے   در پر سفید پوشِ سیہ کار آگئے

تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیرِ زمیں گئے

Scanned with CamScanner

پل بھر میں سوئے دشت جنوں مڑ گئی سماج — اپنے وطن کی شرم، نہ اپنے گرو کی لاج
رسمیں بدل گئیں، تہ و بالا ہوئے رواج — وہ گفتگو رہی، نہ وہ لہجے، نہ وہ مزاج

گھر اپنا گھر گر مست ہی خود موسنے لگی
حد ہے زبانِ دیو پری چوسنے لگی

چلنے لگی لُغت پہ چُھری انتقام کی — چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی — گدّی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے منہ کھولنے لگے
انساں بولیاں وہ نئی بولنے لگے

نسرین و گل کو شعلۂ بے باک کر دیا — سرو و چنار کو خس و خاشاک کر دیا
چھوڑے انار لاکھ کا گھر خاک کر دیا — خود بوئے گل نے دامنِ گل چاک کر دیا

شعلے بھڑک کے اُٹھنے لگے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خائن ہوئے حریم امانت میں باریاب — شیطاں ہے، فرازِ ہدایت کے آفتاب
بیڑے ڈبو چکے ہیں جو بے حدّ و بے حساب — اُن ظالموں کا حضرتِ الیاس ہے خطاب

وہ، جو تمام راہزنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السّلام ہے

Scanned with CamScanner

دیتے تھے صبح و شام سزائیں جو ناروا
گردن پہ جن کی خون ہے مردانِ راہ کا
کل جن کی ڈاڑھیوں کا نشانہ تھے رہنما
ان ڈاڑھیوں کو ہم نے کلف سے لگا دیا

قیدی چھٹے تو خیر سے برباد ہو گئے
جو قید کر رہے تھے وہ آزاد ہو گئے

حکام، مجرموں کے ہیں دامن سئے ہوئے
سی آئی ڈی ہے بادۂ غفلت پیے ہوئے
داروغہ جی ہیں قول بدوں کو دیے ہوئے
چوروں سے کوتوال ہے سازش کیے ہوئے

برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم

غدار تھے جو کل وہ محبِ وطن ہیں آج
بدخواہِ باغ ہمدمِ سرو و سمن ہیں آج
کل تک تھے جو سموم، نسیمِ چمن ہیں آج
خسرو کے جو غلام تھے وہ کوہکن ہیں آج

چھمن کا دل ہے شدّتِ غم سے پھٹا ہوا
در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

مفسد ہیں فوجِ امن کے سالار آج کل
ڈاکو ہیں سیم و زر کے نگہ دار آج کل
زاغ و زغن ہیں مطربِ گلزار آج کل
افسر ہیں بلبلوں کے چڑی مار آج کل

چنگیز خاں ہیں عیسیٰ دوراں بنے ہوئے
کانٹے ہیں چوبِ خیمہ بستاں بنے ہوئے

برطانیہ کے خاص غلامان خانہ زاد   دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حبِ وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب ہے ابتک سَروں کو یاد   وہ آئی سی ایس، اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

سینوں سے اُٹھ رہی ہے وہی بے دلی کی بھاپ   اب بھی بغل میں پن کو دبائے ہوئے ہے پاپ
ماتھے پر اب بھی دولتِ طاغوت کی ہے چھاپ   بیٹے ہیں اس کے آج بھی ہم لوگ اور وہ باپ

آزادیاں ہیں بوئے غلامی لئے ہوئے
اب بھی سَروں پہ تاج ہے سایہ کئے ہوئے

جھونکوں میں رقص و کیف ہے موسم میں اعتدال   لہکا ہوا ہے باغ تو نکھرا ہوا ہلال
لیکن بیاس سرور دبہ ایں کثرتِ جمال   عشاق کی روش ہے نرالی شبِ وصال
معشوقہ ہے ونورِ حیاء سے گڑی ہوئی
اغیار کے گلے میں ہیں بانہیں پڑی ہوئی

اربابِ اقتدار کا اللہ رے کمال   دیکھو تو سر بلند، ٹٹولو تو پائمال
کالوں کے عارضوں پہ ہیں گوروں کے خط و خال   بھارت کا رنگ و روپ ہے، برٹش کی چال ڈھال

ہاتھوں میں پھول جیب میں ڈھیلے لئے ہوئے
ساری گرو کی شان ہیں چیلے لئے ہوئے

Scanned with CamScanner

گو حکم ہے کہ بند شبستان کا دَر نہ ہو
جو آئے، اعتراض کسی شخص پر نہ ہو
قدغن ہے یہ مگر کہ لب خشک تر نہ ہو
اندر سبھا میں لال پری کا گزر نہ ہو

روشن تھے کل جو سُرخ پیالوں کے سامنے
گل آج وہ چراغ ہیں کالوں کے سامنے

وحشت رَوا، عناد رَوا، دشمنی رَوا
ہل چل رَوا، خروش رَوا، سنسنی رَوا
رشوت رَوا، فساد رَوا، رہزنی رَوا
القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی رَوا

انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے۔

جن کے قلم ہیں تیغ و تبر سے لڑے ہوئے
جن کی لڑائیوں کے ہیں جھنڈے گڑے ہوئے
حق پر ہیں جو پہاڑ کی صورت اڑے ہیں
ذلت کے غار میں ہیں وہ اب بھی پڑے ہوئے

شاعر ہو یا ادیب قلندر ہے آج بھی
انگریز کا غلام گورنر ہے آج بھی

وہ شاعرانِ قوم، گراں قدر و معتبر!
رہتے ہیں جن کی جیب میں اسرار بحر و بر
سُورج پہ جن کا ہاتھ ہے اور پاؤں چاند پر
روئی وہ ڈھونڈتے ہوئے پھرتے ہیں در بدر

کیا چیز ہے ادب، یہ کوئی جانتا نہیں!
جانے وہ کیا جو حرف بھی پہچانتا نہیں!

Scanned with CamScanner

وہ جن کی وسعتوں کی کوئی انتہاء نہیں   سب سے سوا انہیں کیلیئے تنگ ہے زمیں
دفتر میں کوئی قید، کوئی بوریا نشیں   وہ ابتری ہے کوئی کہیں ہے کوئی کہیں!

لوگ آئے اور گئے بھی غذا باٹتے ہوئے
یہ رہ گئے دوات و قلم چاٹتے ہوئے

جاہل، حضور کو نظر آتا ہے دُوربیں   عالم کو آنکھ اُٹھا کے کبھی دیکھتے نہیں
باطل، جبھی تو حق پہ چڑھائے ہے آستیں   بیٹھی ہے آسماں کو دبوچے ہوئے زمیں

کوا ہے زمزموں کی ترازو بنا ہوا
مُرغِ چمن ہے کاٹھ کا اُلو بنا ہوا

چھائی ہوئی ہیں زیرِ فلک بدحواسیاں   آنکھیں اداس اداس تو منہ ہیں دھواں دھواں
منکے ڈھلے ہوئے ہیں تو اینٹھی ہوئی زباں   وہ ضعف ہے کہ منہ سے نکلتی نہیں فغاں

اِک دوسرے کی شکل کو پہنچانتا نہیں
میں خود ہوں کون؟ یہ بھی کوئی جانتا نہیں

خاموش ہیں طیور، چمن سرمہ در گلوء   شاخیں فسردہ، خوشۂ انگور زرد رُو
پھُولوں کو اب نہیں ہے تمنائے رنگ و بُو   بلبل کو آشیاں میں قفس کی ہے آرزو

غارت گرِ بہار کا منہ چومنے لگے
آئیں جو آندھیاں تو چمن جھومنے لگے

Scanned with CamScanner

سُرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار   بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم، نہ جوانی نہ جوئے بار   گلشن نہ گل بدن، نہ گلابی نہ گل عذار

اب بُوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

پھر زلزلے میں راکبِ تمکینِ زندگی   بے آئینی ہے ناظمِ آئینِ زندگی
پھر جُرم بن چکے ہیں قوانینِ زندگی   پھر موت ہے پیامِ برِ دینِ زندگی

پھر شکلِ زندگی سے ڈرے جا رہے ہیں لوگ
بس اے حیات بس کہ مرے جا رہے ہیں لوگ

فٹ پاتھ کارخانے، ملیں، کھیت بھٹیاں   گرتے ہوئے درخت سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقین، بھڑکتے ہوئے گماں   ان سب سے اُٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں

شعلوں کے پیکروں سے لپٹنے کی دیر ہے
آتشِ فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار!   وہ سنسنائی آنچ، وہ اُڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ وہ غلطاں ہوا غبار   اے بے خبر وہ آگ لگی آگ، ہوشیار

بڑھتا ہوا، فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

Scanned with CamScanner

کیا گُل بدنی ہے

کس درجہ فسوں کار وہ اللہ غنی ہے کیا موجۂ تابندگی و سیم تنی ہے
انداز ہے یا جذبۂ گردوں زدنی ہے آواز ہے یا بربطِ ایماں شکنی ہے

جنگل کی سیہ رات ہے یا زُلفِ گھنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

یہ لے ہے کہ کھلتی ہوئی غنچے کی کمانی مہکا ہُوا یہ تن ہے کہ یہ رات کی رانی
لہجے کی یہ رَو ہے کہ برَستا ہُوا پانی لرزش میں یہ مژگاں ہے کہ پریوں کی کہانی

یہ سُرخیٔ لب ہے کہ عقیقِ یمنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

محراب ہے رخسار کے پَرتو سے زرافشاں زلفوں میں شبِ تار ہے آنکھوں میں چراغاں
مہندی کی سجاوٹ کہ ہتیلی پہ گلستاں یا حلقۂ عشاق میں ہے چہرۂ تاباں

یا خاتمِ تابندہ پہ ہیرے کی کنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

سینے پہ یہ پلو ہے کہ اک موجِ حبابی ماتھا ہے کہ اک صبح کا پَرتو ہے شہابی
آنکھیں ہیں کہ بہکے ہوئے دو مست شرابی پیکر ہے کہ انسان کے سانچے میں گلابی

گیسو ہیں کہ گُل باری مُشکِ ختنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

Scanned with CamScanner

کاکل میں درخشاں ہے یہ پیشانی رقصاں یا سایۂ ظلمات میں ہے چشمۂ حیواں
ہاتھوں پہ ہے یہ چہرہ کہ ہے رحل پہ قرآں اور چہرۂ گل رنگ میں غلطاں و خروشاں

رخشندگیٔ خون رگِ یاسمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے چھل بل ہے کہ چھاتی کوز میں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے مکھڑا ہے کہ بربت پر کرن پھوٹ رہی ہے

قامت ہے کہ برتائی سردِ چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

تن میں یہ وہ خوشبو کہ ہیں گل سربگریباں چہرے پہ وہ سرخی ہے کہ حیران گلستان
وہ چال میں ہے لوچ کہ شاخیں ہیں پشیماں اور لعلِ گہربار پہ وہ نغمہ ہے غلطاں

وہ نغمہ کہ اک ولولۂ شعلہ زنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

گردن میں چندن ہار ہے ہاتھوں میں ہے کنگن اُمڈے ہوئے عشوے ہیں گرجتا ہوا جوبن
جولاں ہے جوانی کے دھندلکے میں لڑکپن کورا ہے جو پنڈا تو جنوں خیز ہے اُبٹن

گل رنگ شلوکا ہے قبا ناردنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

Scanned with CamScanner

خلوت میں وہ تسلیم ہے جلوت میں تحکم   ساحل پہ تنک موج سفینے میں تلاطم
حجرے میں خموشی ہے شبستان میں تکلم   نغمے میں تنک آہ، خیاباں میں ترنم

آغوش میں تلوار ہے گھونگھٹ میں بنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

ہر نقشِ قدم پر ہے فدا تاجِ کیانی   ہر گام میں ہے چشمۂ کوثر کی روانی
ہر ایک بُنِ مُو سے اُبلتی ہے جوانی   اٹھتی ہے مسامات سے یوں بھاپ سی دھانی

گویا کوئی مہکی ہوئی چادر سی تنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

آنکھوں میں ہے یہ کفر کہ ایمان ہے میرا   عارض پہ ہے یہ خال کا حُوروں کا ہے ڈیرا
پلکوں کی ہے یہ چھاؤں کہ مستی کا سویرا   رُخ پر یہ لٹیں ہیں کہ دُھواں دھار اندھیرا

قامت پر یہ مکھڑا ہے کہ نیزے کی اَنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

جس طرح دُھندلکے میں ہوا اک رنگ سا غلطاں   جیسے کہ دھواں عود کا مندر میں پریشاں
جس طرح اُڑے بام پہ ندربفت کا داماں   جیسے کہ سحر کنج میں آہستہ خراماں

رخسار پہ یُوں صُبح کی اعضا شکنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

Scanned with CamScanner

اِس سن میں بھی پڑتی ہیں حسینوں پر نگاہیں
قدموں کے تلے اب بھی ہیں جوانی کی ہیں داہیں
اب بھی یہ تمنا ہے ملیں پھول سی باہیں
اضیام کو مسکن ہے ہم جوشؔ نہ چاہیں

گھٹی میں پڑی عاشقی و برہمنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

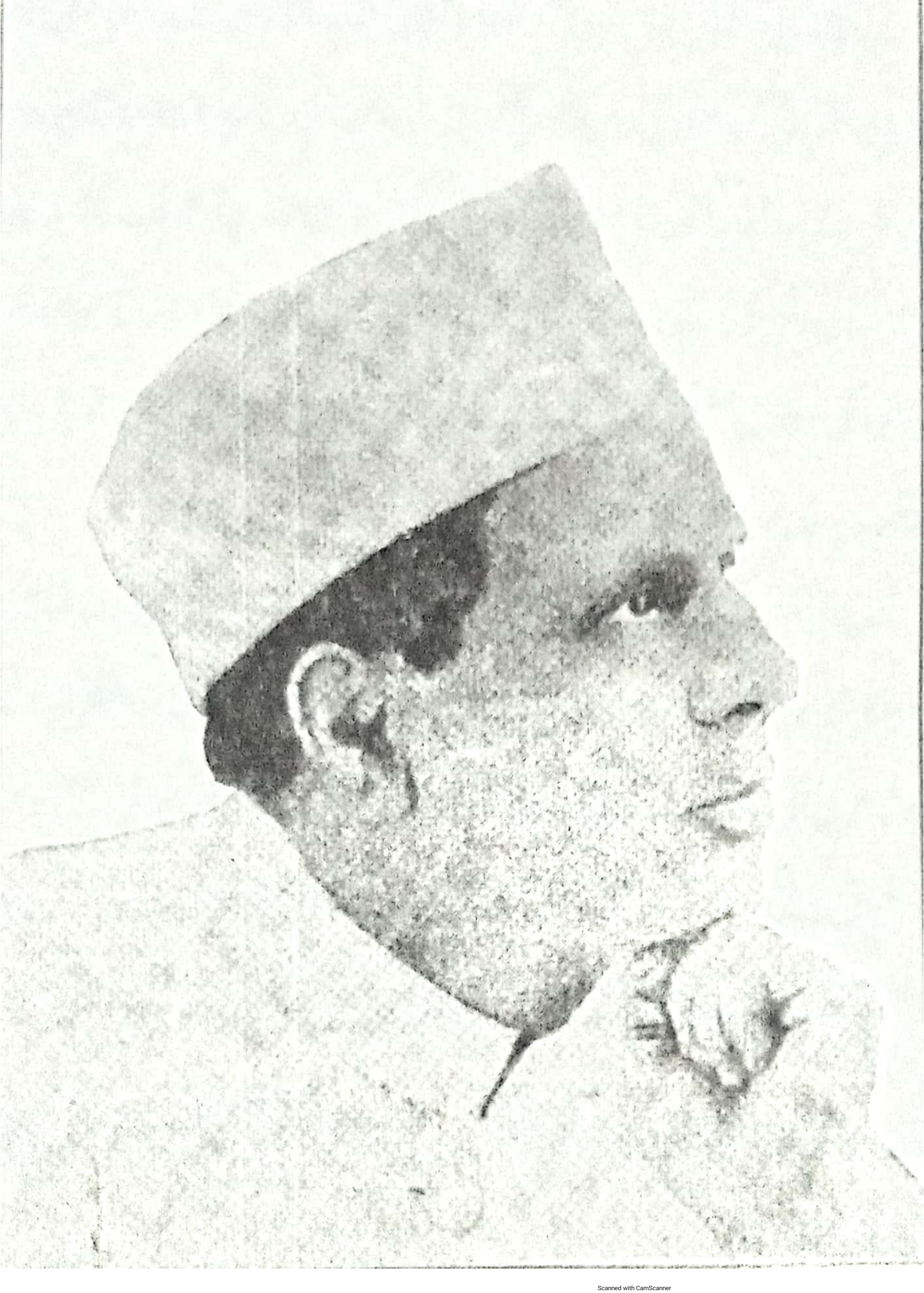

Scanned with CamScanner

فراق گورکھپوری کی غزل، ایک نیا رنگ و آہنگ

اردو ادب کی تاریخ میں یوں تو درجنوں نام ایسے ہیں جنھوں نے شاعری اور تنقید دونوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لیکن ان میں سے صرف دو نام ایسے ہیں جو شاعری اور تنقید دونوں کو متوازی صورت میں ایک خاص بلند سطح تک لے گئے اور دونوں میں رتبۂ اعتبار حاصل کیا، میری مراد انیسویں صدی کے مولانا حالی اور بیسویں صدی کے فراق گورکھپوری سے ہے، یوں تو ہمارے ہاں بیشتر بڑے ناقدین مثلاً مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا آزاد، علامہ نیاز فتح پوری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین اور آل احمد سرور سب ہی نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کا دامن بھی کسی نہ کسی طور پر آخر تک پکڑے رکھا لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں حالی و فراق کے سواء کوئی بھی بیک وقت اپنے عہد کا ممتاز شاعر اور ممتاز ناقد نہ بن سکا، مولانا حالی کی دونوں حیثیتوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہنوز لکھا جا رہا ہے لیکن فراق کی جانب ابھی تک پوری توجہ نہیں دی گئی۔

آپ کی نظر میں فراق بحیثیت ناقد زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا بحیثیت شاعر یہ آپ جانیں لیکن مجھے ان کا شاعرانہ قد و قامت، ان کے ناقدانہ قد و قامت سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور مجھے اس وقت ان کی شاعری ہی کے بارے میں کچھ کہنا ہے وہ بھی غزل اور صرف غزل کے حوالے سے۔

فراق نے اپنے مجموعہ ''شبستان'' کے دیباچے میں اپنی غزل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''یہ غزلیں میری کم و بیش چوتھائی صدی کی مشق سخن کے بعد کا نتیجۂ فکر ہیں یہ غزلیں وحی والہام نہیں ہیں۔ خدا و جبرئیل سے ان کا کوئی تعلق نہیں، نہ عرش و قدس سے ان کا کوئی واسطہ ہے''۔

اک جانی ہوئی دنیا میں اک عالم حیرت ہے
ان دونوں کا مل جانا دنیائے محبت ہے

Scanned with CamScanner

اسی مانوس ترین و عجیب ترین دنیائے محبت کے کچھ ادھ سنے راگ ان غزلوں میں سنائی دیں گے تمام حقیقی محسوسات یا وجدانی تجربات کی الگ الگ آوازیں ہوتی ہیں، شاعر کی انفرادیت، ان محسوسات و تجربات کی خلاقی میں ایک مرکزی عنصر ہے، ان محسوسات و تجربات کے بقیہ عناصر اور روایتوں اور ماحول کی ان فضاؤں کے ہاتھوں بنتے ہیں جن سے اثر لینے کی توفیق شاعر کو نصیب ہوتی ہے۔

فراق نے یہ باتیں اگر چہ شاعری کے عام تخلیقی عمل اور اس کے ماخذ و منبع کے بارے میں کہی ہیں لیکن ان باتوں کا اطلاق جیسا خود ان کی شاعری پر ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ کسی اور ہم عصر غزل گو شاعر پر نہیں ہوتا فراق کی آواز جدید اُردو غزل کی تاریخ میں بالکل نئی اور منفرد آواز ہے، یہ آواز وجدانی ہوتے ہوئے بھی آسمان سے نہیں اتری۔ انہوں نے زمینی آوازوں ہی کی مدد سے اپنی آواز تخلیق کی ہے، اگر چہ ان کے عہد کے متغزلانہ آوازوں میں حسرت، جگر، فانی، اصغر اور یگانہ کی آوازیں ایسی تھیں کہ ان سے بچ کر نکل جانا آسان نہ تھا لیکن فراق کی ذہانت اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیت انہیں ان کے تقلیدی اثر سے بچالے گئی، وجہ یہ ہے کہ اوروں کے برعکس فراق نے شروع ہی سے اپنے سامنے کی گوشت پوست والی دنیا اور اس کے نشیب و فراز سے آنکھ ملائے رکھی ہے، اپنے سیاسی وسماجی اور تہذیبی تجربوں کو تخلیقی تجربے کی بھٹی سے گزارا ہے اور گرد و پیش کی شاعرانہ فضا اور ناقدانہ روّیوں پر بھی نظر جمائے رکھی ہے نتیجتاً ان کی شاعری، طرزِ احساس کے نئے پن اور انداز و آہنگ کی جدت کے باوصف، کلاسیکی رنگ و آہنگ سے الگ نہیں ہونے پائی۔ چراغ سے چراغ روشن کرنے اور قدیم کی کوکھ سے نئی بات کو جنم دینے کا سلیقہ، ان کے یہاں شروع ہی سے ملتا ہے اور اس سلیقے سے انہوں نے آخر تک کام لیا ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی شاعرانہ نہج کی انفرادیت کو کسی نام سے موسوم کرنے کی کوشش کیجئے تو کوئی نام ہاتھ ہی نہیں آتا۔ ہاں اس طرح کا ایک لطیف تصور ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ:

بعد میں اک قربت، ہر قرب میں ایک دوری
اے دوست تجھے کوئی کھوئے ہے نہ پائے ہے

....

Scanned with CamScanner

ہستی کے شبستاں میں یہ کون چراغ دل
رہ رہ کے جلائے ہے رہ رہ کے بجھائے ہے

یہ تصور حقیقت سے دور نہیں ہے، فراق کے عاشقانہ جذبات واحساسات کا التہاب و اضطراب فی الواقع اسی نوع کا ہے یعنی اردو کی عشقیہ شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری سے الگ بھی ہے اور پیوستہ بھی ہے۔ الگ ان معنوں میں کہ فراق کی آواز قدیم وجدید شعراء کے درمیان صاف پہچانی بھی جاتی ہے اور غزل کی کلاسیکی روایت سے پوری طرح ہم رشتہ بھی رہی ہے۔

کہنے کیلئے فراق نے تو غزل کے علاوہ بہت کچھ کہا ہے، نظمیں، مثنویاں اور بھی کچھ ان کے یہاں نظر آتی ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ فراق کی ساری شعری تخلیقات میں یک گونہ جذب و آہنگ سے مستفید ہے اور اس استفادے سے ہر صنف سخن میں کام لیا ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ فراق کو بحیثیت شاعر زندہ رکھنے والی چیز صرف ان کی غزل ہے۔ اگر وہ غزل کے سوا کچھ اور نہ کہتے تو بھی ان کی عظمت اور شہرت ومقبولیت میں فرق نہ آتا۔

فراق کی شاعری کا مشرح مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے مزاج کو غزل سے طبعی مناسبت ہے اور وہ زندگی کے ہر انقلاب وانقباض کو غزل کے قالب میں ڈھال دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ فراق کی جملہ اصناف سخن اور شاعری کے وہی اجزاء دلکش ونظر گیر ہیں جن کا اسلوب اور رکھ رکھاؤ غزل جیسا ہے۔ ان کی رُباعیات میں بھی جو ایک طرح شگفتگی وکشش محسوس ہوتی ہے وہ ان کے متغزلانہ لہجے کے غلبے کے سبب ہے۔

فراق کی شاعری کے بارے میں علامہ فتح پور کی طرح یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ مخصوص والہانہ انداز جو غزل کی جان ہے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اس لئے کہ فراق کی بعض لمبی لمبی غزلوں میں بے کیف اور بھرتی کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ ضرور کہا جائے گا کہ فراق نے اپنے عہد کی زندگی اور اس کی لحہ بہ لحہ متغیر قدروں کو جس خوبصورتی سے اپنے اشعار میں جگہ دی ہے وہ ان کے ہم عصروں سے بہت کم ہوسکا ہے۔ ان تغیر پذیر تہذیبی قدروں میں جیسا کہ خود فراق

Scanned with CamScanner

نے دعویٰ کیا ہے کہ:

عمر فراق نے یونہی بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

غمِ جاناں وغمِ دوراں کو مساوی درجہ حاصل ہے اور یہی وہ اجزاء ہیں جنہیں ساحرانہ اور ماہرانہ انداز سے برت کر فراق نے اردو غزل کو از سرِ نو زندہ وتوانا کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے عہد میں غزل کی طرف سے جو بدگمانیاں اور مایوسیاں پیدا ہونے لگی تھیں انہیں فراق کے لہجے کی ندرت نے نہ صرف یہ کہ دور کر دیا بلکہ ان کی غزل کی بدولت غزل کے امکانات اتنے وسیع ہو گئے کہ اب شبیر حسن خان جوش اور عظمت اللہ خاں کی طرح، غزل کی صنف کو جان سے مار دینے کی کوشش مضحکہ خیز کہلائے گی۔

غزل کے بارے میں مولوی امداد امام اثر کی طرح یہ دعویٰ کرنا تو آسان ہے کہ ''چونکہ واردات قلبیہ اور کوائف ذہنیہ کی کوئی انتہا نہیں اس لئے غزل کا دائرہ محدود ہوتے ہوئے بھی لامحدود ہے لیکن اس لامحدود دائرے کو غزل کے اندر اس طرح سمیٹنا کہ زندگی کے انتہائی مشکل مسائل اور عقدہ ہائے دشوار بھی غزل کے طبع غزل پر بار نہ گزریں، ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی، وجہ یہ ہے کہ ظاہر میں غزل گوئی اس قدر آسان ہے کہ ہر مبتدی اس کی طرف لپکتا ہے لیکن حقیقتاً غزل گوئی کا فن اس قدر دشوار ہے کہ منتہی کو بھی نمایاں مقام بہت مشکل سے ملتا ہے۔ کٹر پن کی ظاہری آسانیوں اور حقیقی دشواریوں پر غور کریں تو غالب کا یہ شعر

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

برجستہ یاد آتا ہے اور اس کا اطلاق، معشوق سے زیادہ معشوق کے بیان یعنی غزل پر ہوتا ہے۔ غرضیکہ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتیں نہ ہوں، وہ غزل گوئی کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا خصوصاً آج کی غزل جس میں زندگی کی ہر تلخ حقیقت، ذہن کی ہر الجھن، قلب کی ہر دھڑکن، سماج کی ہر پیچیدگی اور روح کی ہر بے تابی کو غمِ جاناں بنا کر پیش کرنا

Scanned with CamScanner

ضروری ہو گیا ہے اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

بیسویں صدی کے شعرا میں صرف حسرت اور فراق ہی دو ایسے غزل گو ہیں جنہوں نے غزل کو پستی سے نکال کر ایسی بلندی پر لا کھڑا کیا جہاں سے وہ زندگی کے ہر پہلو کو لطف و نقد کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور ہماری سماجی و تہذیبی زندگی کو سنوارنے اور آگے بڑھانے کیلئے اشارے بھی کر سکتی ہے، البتہ حسرت اور فراق میں فرق یہ ہے کہ حسرت کے اسلوب میں تنوع ،تو جگہ جگہ ہے لیکن خیالات میں ندرت کہیں کہیں ہے یعنی حسرت کے یہاں نئی باتیں کم ہیں، وہ پرانی باتوں کو اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ نئی معلوم ہوتی ہیں اور یہی وہ خاص پہلو ہے جس سے جدید غزل گو شعراء کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے آل احمد سرور نے حسرت کے بارے میں بہت صحیح لکھا ہے کہ

''حسرت نہ صرف آخری عہد کی بڑی یادگار ہیں بلکہ اردو غزل میں برائے نام جو کچھ تحریکیں پائی جاتی ہیں اس کے موجد بھی یہی ہیں''۔

گویا حسرت اردو غزل کی تاریخ میں قدیم و جدید کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں، لیکن فراق کی غزل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حسرت کی عبوری حیثیت سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ فراق کو حسرت کی شاعری سے آگے بڑھنے کے اشارے اور سہارے ملے ہوں لیکن فراق کی غزل میں آج کی زندگی جس حسن کاری کے ساتھ رچ بس گئی ہے وہ حسرت کے یہاں بہت کمیاب ہے چنانچہ زندگی کے نئے میلانات اور رجحانات کی ترجمانی اور اسلوب تراشی میں وہ حسرت سے بہت آگے ہیں۔

فراق نے ایک جگہ کہا ہے کہ ''ان کی شاعری زندگی کی خوابیدہ روحوں کو جگاتی ہے اور جذبات و محسوسات کے منجمد چشموں کو پگھلاتی ہے''۔ ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے۔ ان کے یہاں دوسرے غزل گو شعراء جیسی عاشقانہ فنا دگی اور والہانہ شگفتگی جگہ جگہ نمایاں ضرور ہے لیکن ساتھ ہی اس میں خود اعتمادی اور خود گری و خودنگری کا پرتو بھی موجود ہے۔ وہ حسن کی کارفرمائیوں اور کارکشائیوں سے واقف ہیں لیکن ان کے عشق کی توانائیاں بھی حسن سے کمتر درجے کی نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ توانائیاں شاعر کو عجز و فنادگی، یا خود سپردگی، خود فنائیت پر آمادہ نہیں ہونے دیتیں۔ وہ حسن

Scanned with CamScanner

کی کشش سے کھینچتے ہیں لیکن کم کم، وہ حسن پر جان نثار کرنا چاہتے ہیں لیکن زندہ رہنے کے لئے۔ وہ مٹنا چاہتے ہیں لیکن بننے کیلئے اسی لئے وہ عشق میں ٹیگور کے منفی تصور کے تحت محبوب پر ہر حال میں جان قربان کر دینے کے قائل نہیں، بلکہ وہ حسن کی طرح عشق میں بھی تسخیری قوتیں پاتے ہیں۔ ان کا عشق، حسن کو اپنے اندر جذب کر لینے کا حوصلہ رکھتا ہے اور اپنی ہستی کو حسن کے حوالہ کر کے اپنی انفرادیت کو کھونا نہیں چاہتا، چنانچہ جب کبھی ان کے عشق میں نیاز مندی کا جذبہ زیادہ شدید نظر آنے لگتا ہے تو فراق ٹھٹھک جاتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں اور غیرت و شرم میں ڈوب جاتے ہیں اور خود اپنی ذات پر لعن طعن کرنے لگتے ہیں۔

اپنی تسلیم و رضا پر شرم بھی آنے لگی
ہم نیاز عشق کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے

محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ

''فراق نے اردو شاعری کو ایک نیا عاشق دیا ہے، اس نئے عاشق کی بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں پہلے نظر نہیں آتا''۔

محمد حسن عسکری کا یہ خیال صرف جزوی طور پر درست ہے ورنہ ایسا عاشق، غالب اور اقبال کے یہاں تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ فراق نے ان دونوں سے استفادہ کیا ہے اور نہایت خوبصورتی و کامیابی کے ساتھ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فراق کو اپنی محبت پر پورا بھروسہ ہے۔ ان کی زندگی محبت سے کچھ اس طرح عبارت ہے کہ اگر کبھی ان کے جذبۂ محبت پر افسردگی و اضمحلال کے آثار طاری بھی ہو جائیں تو انہیں اس کا یقین نہیں آتا اور کہہ اٹھتے ہیں:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسہ بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

Scanned with CamScanner

اجمالاً یوں سمجھئے کہ عشق کو فراق، انسان کا اعلیٰ جوہر سمجھتے ہیں اور سخت سے سخت آزمائش کے وقت بھی نہ وہ اس سے بدگمان ہوتے ہیں اور نہ اس کی مسلسل صبر آزمائیوں سے جی چھوڑتے ہیں بلکہ وہ اس معاملہ میں اتنے حوصلہ مند واقع ہوئے ہیں کہ غم طلبی وغم جوئی کی تمنا ان کے یہاں ہر آن بڑھتی رہتی ہے، پھر چونکہ فراق عشق کے کامیاب مال کار پر یقین رکھتے ہیں اور اسے ہمیشہ رجائی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے تاریک سے تاریک اور ہولناک سے ہولناک فضا میں بھی وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوتے، گویا ان کا عشق ایسا سالک ہے جو راہ ورسم منزل سے پوری طرح باخبر ہے ہر چند کے عشق عموماً اکثر درد و کرب، سوز وتپش، التہاب و اضطرار اور پیچ وتاب کی صورتیں اختیار کرتا ہے لیکن فطرت نے فراق کو ایسی چشم حقیقت شناس عطا کی ہے کہ وہ شام غم کی تاریکی میں بھی نور سحر کی لپک دیکھ لیتے ہیں اور کڑی سے کڑی منزل میں بھی عشق کی دستگیری و رہنمائی میں مقصود حیات تک پہنچ جاتے ہیں، اس حوصلہ مند عشق کی مدد سے فراق ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا بن کر افتادہ اور عاجزانہ انسانوں کو غزل کے ساز پر انقلاب واحتجاج کے حیات افروز نغمے سناتے ہیں اور انسانیت کو جبر وتشدد کے خونی پنجوں سے نجات دلانے کی سعی کرتے ہیں، چند اشعار دیکھئے:

اس اضطراب میں راز فروغ پنہاں ہے
طلوع صبح کے مانند تھرتھرائے جا

....

اس نرم نگاہی سے چمک اٹھتا ہے اے دوست
وہ درد جو انساں کو بنا دیتا ہے انساں

....

فراق دوڑ گئی روح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا ترے فسانے میں

....

Scanned with CamScanner

دل جلے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

....

رکھتے دل سے نغمہ ساز محبت چھیڑ دے
آپ رک جائیں گی جنگیں کافر و دیندار کی
جہاں کو دے گی محبت کی تیغ، آب حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

ان شعروں میں زندگی کے کیسے جرأت مندانہ نغمے بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ساز میں خلش واضطراب کے تار کام کررہے ہیں لیکن ساز کے تاروں سے ایسا روح پرور سرور برس رہا ہے کہ آب حیات بن کر زندگی کی کشت زار کو سرسبز وشاداب بنادیتا ہے۔

فراق کے کلام کی بڑی خصوصیت ان کے تخیل کی رنگارنگی، تنوع پسندی اور جذبات و محسوسات کی فراوانی ہے۔ فراق کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بھی یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ غزل کی قلمرو تنگ نہیں، بہت وسیع ہے اور اس میں شعور و لاشعور اور داخلیت و خارجیت کے سارے مسائل و معاملات اور جملہ انسانی افکار باآسانی جگہ پاسکتے ہیں۔ بے شمار محسوسات ایسے ہیں جن سے ہم آپ آئے دن دوچار ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کرپاتے اور اگر محسوس بھی کرلیں تو یہ صلاحیت ہر آدمی میں کہاں ہوتی ہے کہ اپنے تاثر کو پوری طرح دوسروں تک پہونچا سکے۔ فراق کو اس نوع کے مسائل کے ابلاغ و اظہار پر حیرت انگیز دسترس ہے مثلاً محبت میں جان دیدینا اور اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں گم کردینا یا اس کی تلاش وتمنا میں مٹ جانا اردو شعراء کا بہت عام اور پسندیدہ موضوع اور مشغلہ رہا ہے چنانچہ فراق سے پہلے غالب اور اقبال کے سواء ہمارے یہاں سب ہی نے خود فراموشی وخود سپاری ہی کو عشق کا حاصل جانا ہے۔ لیکن فراق عشق میں فنا کے قائل نہیں، وہ نہ تو عشق کی سختیوں سے ہراساں ہوتے ہیں اور نہ محض جان دیدینے کو

Scanned with CamScanner

محبت کا کمال سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جان سے گزر جانے ہی کو عشق کا حاصل جانتے ہیں وہ ان سے صاف کہہ دیتے ہیں کہ:

اہل دل تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثار محبت جان دیدینا نہیں

اپنی ایک رُباعی میں بھی اس خیال کی مزید وضاحت اس طور پر کردی ہے کہ:

کرتے نہیں کچھ کام تو کرنا کیا آئے
جیتے جی جان سے گزرنا کیا آئے
رو رو کے موت مانگنے والوں کو
جینا نہیں آسکا تو مرنا کیا آئے

غرض کہ فراق کے نزدیک وصال ہی عشق کی معراج نہیں ہے۔ ان کی دنیائے آرزو اس سے بھی کہیں وسیع ورفیع ہے وہ وصال کو ایک بڑی نعمت سمجھتے ہیں لیکن اس سے عظیم تر اور قابل قدر کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو ان کے پیش نظر ہیں اس لئے وہ صرف وصال سے مطمئن نہیں ہوتے اور بڑے خوبصورت انداز میں اپنے محبوب کو آگاہ کر دیتے ہیں کہ

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

ہر چند کے زندگی اور عاشقانہ زندگی میں موت کا تصور سب سے مہلک تصور ہے لیکن فراق اس مہلک تصور سے کبھی نہیں ٹھٹھکے اور نہ کبھی اپنے اُوپر خوف ویاس مسلط ہونے دیتے ہیں۔ وہ مشکلات کے داعی ہیں اور ان کی طبیعت، اقبال کی طرح خطر پسند ہے انہیں یقین ہے کہ خطرات سے زندگی جاگتی ہے اور مشکلات سے قوت عمل میں چستی و تیزی آتی ہے۔ جس قدر دشواریاں سامنے ہوتی ہیں اسی قدر دماغی حس بیدار و ہوشیار رہتی ہے، وجہ یہ ہے کہ کائنات میں ارتقاء کا اصول کارفرما ہے اور یہ اصول تضاد کا پابند ہے۔ اس پابندی کے تحت ''لطافت'' کے لئے کثافت،

Scanned with CamScanner

عشق کیلئے حسن، غم کیلئے خوشی مشکل کیلئے آسانی، نیکی کیلئے بدی اور زندگی کیلئے موت لازم وملزوم ہیں۔ رجائی نقطہ نظر رکھنے والے منکروں اور اہلِ حکمت کے یہاں تو کائنات کی حقیقت صرف زندگی ہے۔ موت تو زندگی کا یک تتمہ ہے جس کے بغیر حیات کا مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ موت بالذات کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جیسا کہ نفسیات کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ اصل صورت کچھ اس طور پر ہے۔

We need not fear death. Death is the only thing that we can never feel. Whenever we are, death, is not. When death comes we are not

غرض کہ موت تو صرف زندگی کی پیغامبر ہے خواہ اس دنیا کی زندگی ہو یا کسی اور دنیا کی اس لئے موت جس قدر قریب ہوتی ہے زندگی اسی قدر متحرک اور فعال ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ موت کی نزدیکی سے رگ رگ میں گرمی وحرارت کے وہ آثار جاگ اٹھتے ہیں جو زندگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ فراق نے اس نفسیاتی نکتے کو غزل کے ایک شعر میں کیسے اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

آج رگ رگ میں جان دوڑ گئی
موت نے زندگی کو چھیڑ دیا

جب موت کے بھیانک تصور سے کسی شاعر کے روئیں نہ کھڑے ہوتے تو ظاہر ہے کہ غم گیتی وغم روزگار کے شدید سے شدید حملے اسے مجبور ومغلوب کیونکر بنا سکتے ہیں؟ غم کے تھپیڑے تو آدمی کو جگانے کیلئے لگائے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ نیند کے متوالے دوبارہ سو جاتے ہیں، بقول فانی

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

اس لئے غم کو دشمن حیات جاننا مناسب نہیں۔ بعض کے نزدیک تو غم آشنائی کے بغیر

Scanned with CamScanner

خوشی سے لذت آشنا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ زندگی کے ارتقاء کا انحصار صرف غم پر ہے ورجسے کم فہمی یا کج فہمی سے بخوشی تعبیر کیا جاتا ہے وہ عدم غم یا انحطاط رنج کا ہی دوسرا نام ہے۔ انگریزی کے شاعر کوپر (Cowper) نے کیا اچھا کہا ہے۔

The fath of sorrow and path alone, goes to the land where sorrow is unknown.

(غم اور صرف غم کا راستہ وہاں تک جاتا ہے جہاں غم کا نام ونشان بھی نہیں ہے)۔

شاید اسی لئے دنیا کے بہت سے شاعروں نے غم کو عین خوشی جانا ہے یا نشاط غم سے تعبیر کیا ہے خود اردو شاعری میں اس تصور کے بہت خوبصورت نمونے موجود ہیں:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

(فانی)

....

سب اس کے آگے ہیچ، ہیں دنیا کی لذتیں
پروردگار دے تو غم روزگار دے

(حسرت موہانی)

....

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

(جگر)

....

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

(اقبال)

Scanned with CamScanner

اور اگر بغرض محال، غم میں کوئی لذت نہ ہو تو بھی اس سے مفر کہاں یعنی غم کو اپنانے کے سواء چارہ کار بھی کیا ہے بقول غالب:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی وہ نکتہ ہے جس کے سبب فراق، غم کو زندگی کیلئے عذاب نہیں جانتے بلکہ وہ اسے حیات افروزی کا سبب سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے غم سے دوچار ہو کر بھی ان کی غم طلبی و غم کوشی میں کمی نہیں آتی وہ بڑی حوصلہ مندی و بے نیازی کے ساتھ کہتے رہتے ہیں کہ:

یوں تو ہزار رنج سے روتے ہیں بدنصیب
تم دل دکھاؤ وقت مصیبت تو بات ہے

اردو شاعری میں جبر و اختیار کے مسئلے نے بھی غم اور خوشی کو غلط رُخ دے دیا ہے۔ اقبال سے پہلے ہمارے بیشتر شعراء نے جس میں صوفی و غیر صوفی دونوں شامل ہیں، آدمی کے ہر فعل کو غیر اختیاری ہی قرار دیا ہے اور انسان کو مجبور محض بتا کر اسے کائناتی ارتقاء کا اس طرح پابند کر دیا کہ اس کے ذاتی امکانات کا خاتمہ ہو گیا۔ تمام موجودات و کائنات کو موہوم اور نظری کہا گیا حتیٰ کہ خیر و شر کو بھی احکام خداوندی سے منسوب کر کے انسان کے عدم وجود اور اس کے افعال و کردار اور احتسابی نظام کو بے مقصد و لاحاصل بنا دیا گیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا
(میر)

....

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
(غالب)

....

Scanned with CamScanner

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر کو درکار نہیں

(فانی)

....

ہوئی ہے فطرت انسان میں طرفہ حکمت صرف
سب اختیار میں اور کچھ بھی اختیار نہیں

(صفی لکھنوی)

زندگی کے بارے میں یہ منفی رجحان، اردو شاعری میں عام ہے، اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس روح فرسا اور حیات کش فلسفہ کو باطل ٹھہرایا اور انسان و انسانیت کیلئے ارتقاء کی نئی راہیں پیدا کیں۔ فراق بھی انسان کو یکسر مجبور تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں لیکن ان کا استدلال منطقی نہیں، نفسیاتی اور شاعرانہ ہے۔ انہیں یقین ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق سے اتنا ہی عشق ہے جتنا کہ مخلوق کو خالق سے اور باوجودیکہ وہ جبّار و قہار ہے پھر بھی اس سے اپنے بندوں کی بیچارگی اور بے کسی نہیں دیکھی نہیں جاتی۔ قہاری و جبّاری کے باوجود وہ جب کبھی اپنے بندوں کو مجبور و مظلوم اور فتادہ و عاجز پاتا ہے تو جذبۂ ترحم سے مجبور و مغلوب ہو کر رحم و کرم کی بارش کر دیتا ہے، اس کیفیت کو فراق نے شدت سے محسوس کیا ہے اور جبر و اختیار کے مسئلے کا ایک نفسیاتی حل پیش کیا ہے صرف ایک شعر دیکھئے:

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل
مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں

فراق کے نزدیک مجبوری سب سے بڑی طاقت اور بے کسی سب سے بڑی قوت ہے۔ سعدی نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ:

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود
برآرد بچنگال چشم پلنگ

Scanned with CamScanner

ہر چند کی یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب آدمی خود کو یکسر بے یارومددگار پاتا ہے تو اس کی ساری مدافعانہ قوتیں یک بیک ابھر آتی ہیں اور وہ بڑے سے بڑے طاقتور پر بھی قابو پالیتا ہے۔ مشیت کے دریائے رحمت کو جوش دلانے کا سبب بھی فراق کے نزدیک بندوں کی بیچارگی و مجبوری ہے۔ گویا کائنات اور خالق کائنات دونوں کسی نہ کسی طور پر جبر کے تابع ہیں۔ خصوصاً پچھلے سو سال میں دنیا میں انقلاب رونما ہوئے ہیں ان سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ سامراج اور سرمایہ داری و جاگیرداری کے جبر و استبداد کا زور صرف مجبوروں کے ہاتھوں ٹوٹا ہے۔ دنیا کے ناتوانوں، کمزوروں، نہتوں اور بھوکوں نے پے در پے انقلاب لاکر انسانیت کے سامنے کئی سرمایہ پرستوں اور زراندوزوں کے نمائندوں کو دنیا کے سامنے دست بستہ کھڑا کر دیا ہے، یہی نہیں ظالموں کی طرف سے سخت روک تھام کے باوجود، مجبوروں اور مظلوموں کی پکار پر بڑے سکون و خاموشی سے انقلاب کا غیر محسوس دھارا ان کی طرف بڑھتا چلا آتا ہے۔

ہوا کا یہ رخ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ انسانی اقدار کے تحفظ و ترقی کی اساس ہی پر کوئی نظام اقتدار باقی رہے گا اور شخصی اقتدار دنیا سے اٹھ کر رہے گا۔ مغرب سے قطع نظر، مشرق میں پچھلی دو تین دہائیوں کی قلیل مدت میں جس تیزی سے انقلابات آئے اور مراکش و مصر سے لیکر جاپان و کوریا تک زندگی نے جتنی سرعت سے کروٹیں بدلیں اس کی ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہم وقت کا منہ تکتے رہے، انقلاب کے قدموں کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی اور انقلاب سر پر آ گیا، زندگی کی اس تغیر پسند حقیقت کو فراق نے جس خوش اسلوبی سے تغزل میں سمو کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے:

دیکھ رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

....

دل کے دھڑکوں میں زور ضربِ کلیم
کس قدر اس حباب میں دم ہے

....

Scanned with CamScanner

اس میں ٹھہراؤ یا سکون کہاں
زندگی انقلاب پیہم ہے

وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا یہ رنگ فراق کے سارے کلام میں جاری وساری ہے عہد حاضر کا شاید ہی کوئی سماجی وسیاسی مسئلہ ہوگا جسے فراق نے غزل میں نہ سمو دیا ہو۔ زندگی کی ہر وہ ذہنی یا روحانی کشمکش اور ہر وہ کثافت یا لطافت جس سے انسان دوچار ہوا ہے تغزل بن کر فراق کی غزلوں میں رچ گئی ہے۔ یہ کیفیت بے سبب نہیں اس کا سبب ہے۔ فراق کا محبوب کوئی آسمانی مخلوق نہیں انسان ہے اور وہ انسان کے غم وخوشی میں شریک رہنا چاہتا ہے۔ فراق یقیناً فردکی محبت کے قائل ہیں لیکن اجتماعی مقصد ومحبت کی چوکھٹ پر اسے قربان کردینے پر آمادہ بھی رہتے ہیں۔ غمِ دنیا کو ہمیشہ غمِ محبوب پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور دنیا کے دکھ درد کو دیکھ کر اپنے ذاتی دکھ درد کو بھول جاتے ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں:

چپ ہوگئے تیرے رونے والے
دنیا کا خیال آگیا ہے

فراق نے اس مخصوص نہج سے ہٹ کر بھی شعر کہے ہیں لیکن وہ بھی اسلوب وخیال، دونوں کے اعتبار سے اردو غزل کی دنیا میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے کلام میں حسن وعشق کی بہت سی کیفیتیں ایسی ملیں گی جن کو غالباً فراق نے پہلی بار محسوس کیا اور اگر ایسا نہیں تو کم از کم وہ اسے غزل کے ذریعے سب سے پہلے منظر عام پر لائے ضرور ہیں چنانچہ بہت سی نفسیاتی کیفیتیں ایسی ہیں جن سے اُردو غزل کو لوّل اوّل فراق نے آشنا کیا۔ اسی کے ساتھ بہت سی پرانی کیفیات ایسی ہیں جن کو فراق نے ادنیٰ تبدیلی اور بدعت اسلوب کے ساتھ اس طرح اپنالیا کہ وہ انہیں کی ہوکر رہ گئی ہیں۔ بعض اشعار کے ذریعے یہ بات شاید زیادہ واضح ہوسکے گی۔ مثلاً زندگی کی سخت کوشیوں اور شدت غم کی طغیانیوں میں جب انسان میں ضبط، مقابلہ کی تاب نہیں رہتی تو اشکوں کے سیلاب میں ڈوبنا ہی پڑتا ہے یعنی آدمی روتا ہے اور خوب جی بھر کر روتا ہے، ایسا کرنے

Scanned with CamScanner

سے جسم ورُوح کا پیچ وتاب تھم جاتا ہے، اشکوں کے سیلاب میں دل کی کدورت وکسالت اور گرانی و گراں باری اس طرح بہہ جاتی ہے کہ دل کے شفاف آئینے میں سکون وسرور کے سواء اور کچھ نہیں رہ جاتا یعنی جی بھر کے رو لینے سے ایک طرح کا سکون میسر آتا ہے اور جی ہلکا ہو جاتا ہے۔اس عمل اور تجربے سے اکثر صاحبان دل گزرے ہوں گے لیکن فراق کے سواء اس نوع کے سکون وسرور کا احساس شاید کسی دوسرے اردو شاعر کو نہیں ہوا اور اگر کسی نے اسے محسوس بھی کیا ہے تو اس کے اظہار میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔فراق نے نفسیاتی سچائی کو ایک شعر میں کیسے اچھے پیرائے میں بیان کر دیا ہے کہ:

رو کر عشق خموش ہوا ہے
وقت سہانا اب آیا ہے

اس بات سے کون واقف نہیں کہ اس عام آب گل میں جہاں مسلسل جدوجہد کا نام زندگی ہے، سکون ملنا دشوار ہے غم عشق وغم روزگار کی کوئی نہ کوئی الجھن انسان کے ساتھ لگی رہتی ہے خصوصاً عشق کی دنیا میں تو سکون نصیب ہونا ایں خیال است محال است وجنوں، کا مصداق ٹھہرتا ہے۔لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ عشق کی مشکل پسند فطرت کو آسانیاں نہ بھاتی ہیں اور نہ راس آتی ہیں۔اس لئے عشق سکون کے نام سے ڈرتا ہے اور مصلحتاً اس سے گریز پا رہتا ہے۔اقبال نے اسی شوق بے پایاں کے تحت کہا تھا کہ:

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

فراق نے اسے دوسرے دلائل سے مربوط کر کے غزل میں اس طور پر ڈھال دیا ہے

یوں بھی مشکل ہے کچھ سکوں ملنا
عشق کی مصلحت سے دور بھی ہے

اسی طرح، یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ کائنات کی تخلیق کا سبب دراصل خالق کا خود

Scanned with CamScanner

اپنی ذات سے عشق ہے اور کائنات کی آفرینش کا مقصد صرف یہ ہے کہ خالق، خود اپنے حسن و اعجاز حسن کا مشاہدہ کرے، میرؔ سے لے کر اقبالؔ تک سب نے اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
(میرؔ)

دہر، جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
(غالبؔ)

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید
از نقش ایں دآں بہ تماشائے خود رسید
(اقبالؔ)

اس وحدت الوجدی فکر کے مطابق گویا خالق و مخلوق ایک ہیں۔ انسان جسے خالق کائنات کا پرتو کہا جاتا ہے اور اپنی اصل سے بچھڑ گیا ہے اور خود اپنی تلاش میں روز ازل سے سرگرداں ہے لیکن فطرت کے بے شمار مظاہرات میں وہ بھی کبھی کبھی ایسا گم کردہ راہ ہو جاتا ہے کہ اپنی کوتاہ نظری سے اصنام خیالی کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ تعینات کے یہی پردے ہیں جنہوں نے اسے معرفت ذات سے محروم کر رکھا ہے ہر چند کہ انسان اپنی تلاش میں روز آفرینش سے کھویا ہوا ہے لیکن نہ اسے اپنا سراغ ملتا ہے اور نہ ہی حقیقت اس پر آشکار ہوتی ہے۔ فانیؔ نے اس خیال کو ایک شعر میں یوں سمو دیا ہے:

مجھے بلا کر یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ مہمان ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

اس خیال کو ترقی دینا دشوار تھا۔ لیکن فراقؔ نے اسے ایسی ترقی دے دی کہ وجدان جھوم جھوم اٹھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

صبح ازل میں یونہی ذرا لڑ گئی تھی آنکھ
وہ آج تک نگاہ چرائے ہوئے سے ہیں

مشرق کی عشقیہ روایت میں، لاکھ اشتیاق کے باوصف محبوب اپنے عاشق سے بے باکانہ ملنے کی ہمت عموماً نہیں کرتا۔ بدنامی ورسوائی کا خیال اسے بے تکلف ہونے سے بہ ہرگام مانع رکھتا ہے لیکن اصل سچائی یوں ہے کہ محبوب بھی عاشق کی جدائی میں اسی طرح ماہی بے آب رہتا ہے، جس طرح عاشق، محبوب کی جدائی میں۔ محبوب کبھی کبھی آزمائش وامتحان کی غرض سے اپنے چاہنے والوں کو دانستہ پریشان کرتا ہے، جلاتا ہے، ستاتا ہے، کڑھاتا ہے اور بظاہر قہر وغضب بھی ڈھاتا ہے۔ ایسا قہر وغضب کہ محبوب کی محبت پر شبہ ہونے لگتا ہے پھر بھی محبوب اپنے اندر کی آتش فشاں کو بہر حال دبائے رکھتا ہے۔ لیکن اسے دبائے رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مصیبت کی آگ واقعی ٹھنڈی پڑ چکی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ محبوب کے اندر بھی محبت کا شعلہ برابر لپکتا رہتا ہے اور عاشق سے چھٹنے کے بعد اس کا حال بھی عاشق کے حال سے کم خراب وخستہ نہیں ہوتا۔ جگر نے کیا خوب کہا ہے:

یہ مانا بھیج دے گا ہم کو محشر سے جہنم میں
مگر جو دل پر گزرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا

آرزو لکھنوی کا بھی ایک شعر سن لیجئے:

وحشت ہم اپنی، بعد فنا چھوڑ جائیں گے
پھر تم پھرو گے بال پریشاں کئے ہوئے

دونوں شعر خوب ہیں اور غزل میں اس کو اس سے بہتر پیرائے میں بیان کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن فراق نے اس خیال کو ترقی دے کر جس معراج پر پہنچا دیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے:

محشر میں میرا دامن اب چھوڑتے نہیں ہیں
اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

Scanned with CamScanner

اردو شاعری میں یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ جسے عشق کہتے ہیں وہ عام انسانی دسترس و ادراک سے ماورا ہے وہ ایک طرح کا فیضانِ الٰہی ہے عشق کا زور سب پر چلتا ہے لیکن اس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ سچا عشق بہت کم لوگوں کو عطا ہوتا ہے۔ صوفیوں کے یہاں، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اکثر قلوب انسانی اس کی حرارت و شدت کی تاب نہیں لا سکتے، چنانچہ اکثر کے یہاں عشق نہیں صرف عشق کی تمنا ہوتی ہے جسے وہ نافہمی سے عشق سمجھنے لگتے ہیں اور یہی گمراہی و بے راہ روی عشق میں جب عام ہو جاتی ہے اور ہر شخص عشق کو خود اختیاری فعل جان کر عشق کو تماشا بنانا چاہتا ہے تو اس طرح عشق اور اہل عشق دونوں کی آبرو خاک میں مل جاتی ہے ان کا وہ وقار و اعزاز بوالہوسی و خامکاری کے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے یونہی نہیں کہا تھا کہ:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فراق نے اس خیال کو نظم کیا ہے لیکن انہوں نے بوالہوسی کا مبدا و منبع فطرت ہی میں تلاش کیا ہے اور عشق کی رسوائی کا سبب اسی مبدا فیض کا ٹھہرایا ہے جس نے ہر اہل وفا کو محبت کی نعمت و توفیق بخش دی۔ کیا خوب کہا ہے:

زیادہ ظرف سے دنیا بھی کوئی دنیا ہے
ہر اک نے تیری محبت کا جام چھلکایا

مختصر یہ کہ فراق کی غزل گوئی موضوع و اسلوب دونوں کے اعتبار سے حیرت انگیز انفرادیت کی مالک ہے۔ نیاز فتح پوری کے الفاظ میں:

''شاعری کیلئے الفاظ کا انتخاب اور طرزِ ادا نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر کسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے، پھر چونکہ فراق کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدر اوّل کا مرتبہ نہ دیا جائے''۔

Scanned with CamScanner

واقعہ بھی یہی ہے کہ فراق صف اوّل کے غزل گو شاعر ہیں اور ان کی غزل ہر پہلو سے قابلِ توجہ ہے۔ انہوں نے زندگی کے بیشتر مسائل و حقائق اور انسان کے عمومی جذبات و محسوسات کو غزل کے قالب میں ڈھال کر، دلوں میں اس طرح اتار دیا ہے کہ داد دیتے ہی بنتی ہے۔ چند اشعار اور دیکھئے:

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

....

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے
تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ

....

کبھی سازِ طرب سُن کر بھی نظریں بھیگ جاتی ہیں
ندائے شاعر فطرت الم کی داستاں کیوں ہو

....

ایک کو ایک خبر، منزل عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہل کارواں شامل کارواں نہ تھا

....

چمکتے درد، کھلے چہرے، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرز نو سے بزمِ حیات

....

تیرہ بختی نہیں جاتی، دل سوزاں کی فراق
شمع کے سر پہ وہی اب بھی دھواں ہے کہ جو تھا

....

Scanned with CamScanner

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

....

دلوں نے تجھ سے بھی جس کو بچا کے رکھا تھا
نگاہ یار وہی درد آج کام آیا

....

مقصود ہے محبت، لیکن اسی کے ہاتھوں
یہ بھی ہوا کہ میں نے تیرا برا بھی چاہا

....

وہ مخاطب بھی ہیں قریب بھی ہیں
ان کو دیکھوں کہ ان سے بات کروں

....

کسی کے جور و نوازش میں فرق سہل نہ تھا
سمجھ سمجھ کے محبت بھی آج روئی ہے

....

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ مجھ سے تجھے وہ شکوۂ بے جا بھی نہیں

....

بدگماں ہو کہ مل اے دوست جو ملنا ہے کبھی
بے جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

....

Scanned with CamScanner

یہ اشعار اُردو میں اقبال اور حسرت کے بعد ابھرنے والی غزلیہ شعری آواز کے نمائندے ہیں۔اقبال وحسرت سے مستفیض ہونے کے باوصف فراق کے اشعار کا ذائقہ حسرت و اقبال سے بہت الگ ہے۔اتنا الگ کہ اسے جدید اردو غزل کا بالکل نیا لہجہ کہنا پڑتا ہے۔فراق کی غزل کے اس لب ولہجہ نے بعد میں ابھرنے والے سارے غزل گوشعراء کو متاثر کیا ہے اور جدید اردو غزل کے اس رنگ وآہنگ سے ہم رشتہ کردیا جوفراق کے زیر اثر اقبال وحسرت کے بعد وجود میں آیا ہے۔

Scanned with CamScanner

فراق گورکھپوری، بحیثیت رُباعی نگار

اردو فارسی کی کلاسیکی اصناف سخن میں رباعی مختصر ترین ہے اس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے، وحدت خیال کے ساتھ تسلسل بیان کی پابندی بھی از بس ضروری ہے، غزل کی طرح، رباعی مردّف بھی ہوسکتی ہے اور غیر مردّف بھی مطلب یہ ہے کہ خواہ صرف قافیہ لائیں یا قافیہ و ردیف دونوں، جیسا کہ فارسی شعراء کے اولین تذکرے لباب الالباب میں دیئے ہوئے منتخبات سے پتہ چلتا ہے کہ قدما چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے، تاہم اردو فارسی کے تمام علمائے فن اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ تسلسل مضمون کی شرط یہ ہے کہ نفس مضمون پہلے مصرعے سے شروع ہوکر چوتھے مصرعے تک برابر ارتقاء کرتا رہے اور مؤثر انداز میں واضح ہوتا رہے، فراقؔ گورکھپوری نے اس خیال کو ایک رباعی میں یوں نظم کیا ہے۔

پہلے مصرے میں حسن کا خطِ جبیں
اور دُوسرے مصرعے میں لٹوں کی تزئیں
چوتھا ہو، نکلتا ہوا یوں تیسرے سے
جیسے بھیگی مسیں ہوں ابرو سے حسیں

فارسی میں دوسری اصناف شعر کی طرح رُباعی کی مثالیں شروع ہی سے ملتی ہیں لیکن اس کو زندہ و پائندہ رکھنے میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام اور سرمد نے خاص کردار ادا کیا، یہی صورت کم و بیش اردو رُباعی کی ہے۔ رباعی کے نمونے محمد قلی قطب شاہ کے دور سے ہی ملتے ہیں لیکن جن شعراء نے اسے فنِ کمال تک پہنچایا اور جن کی بدولت وہ مقبول ہوئی، اُن میں امجدؔ حیدر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری کے نام آتے ہیں۔ ان سے پہلے انیسؔ و دبیرؔ اور حالیؔ و اکبرؔ نے ملی و قومی جذبے کے تحت ناصحانہ اور مصلحانہ مزاج کی رُباعیاں کہہ کر ناموری حاصل کی تھی لیکن امجدؔ، جوشؔ و فراقؔ اور یگانہؔ کی رُباعیوں کا افق، ان سے بلند اور وسیع ہے، پھر بھی اگر ان کی رُباعیات کے

Scanned with CamScanner

اختصاصی و امتیازی نشانات پر غور کریں تو بہ حیثیت مجموعی، امجد حیدر آبادی متصوفانہ خیالات کے شاعر ہیں، جوش کی رُباعیات شباب و انقلاب کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں اور فراقؔ کی رُباعیاں احساس جمال و عاشقانہ مزاج کی ترجمان ہیں۔

فراق کی رُباعی گوئی کی عمر، ان کے دو بڑے ہم عصروں یعنی امجد و جوش کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ پھر بھی وہ اپنی فنی بصیرت، جمالیاتی احساس، اچھوتے اسلوب اور موضوع کی ندرت کے سبب بہت جلد صف اول کے رُباعی نگاروں میں شامل ہو گئے۔ اردو رُباعی کو پر مغز اور مقبول بنانے میں وہ امجد و جوش کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ فراقؔ کی رُباعیوں کا مجموعہ ''روپ'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ ''روپ'' کا انتساب جوش کے نام ہے۔ کتاب کے شروع میں فراقؔ صاحب کا ایک مفصل دیباچہ بھی شامل ہے جس میں فراق اپنی رُباعی گوئی کی ابتدا کے متعلق جوش کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔

''بعد کو دلی کے اس قیام میں مجھ سے تم سے (جوش سے) اَن بن ہو گئی تھی اور آپس میں تیز تیز باتیں بھی ہو گئی تھیں۔ الٰہ آباد آ کر جو پہلی چیز مجھ سے ہوئی وہ ایک رُباعی ہوئی۔ جس میں میں نے تم کو مخاطب کیا اور اس اَن بن کی طرف اشارہ کیا۔ رُباعی یہ تھی۔

معصوم خلوص باطنی کچھ بھی نہیں وہ قرب و قدر باہمی کچھ بھی نہیں

اک رات کی وہ جھڑپ وہ جھک جھک سب کچھ اور آٹھ برس کی دوستی کچھ بھی نہیں

یہ رُباعی کا شگون تھا اسے کہنے کے دو ہفتوں کے اندر اندر سو رُباعیاں ہو گئیں''۔

فراقؔ کی رُباعیاں معنوی حیثیت سے جوش و امجد دونوں سے مختلف ہیں۔ امجد کی روحانیت اور جوش کی آتش نفسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ طبعاً جمال پرست اور رومان پسند واقع ہوئے ہیں اور یہی شدید جمالیاتی احساس اور سنجیدہ رومانی تفکر ان کی رُباعیوں میں حسن افروزی اور اثر آفرینی کا ضامن ہے۔ فراقؔ کے اندازِ بیان میں لچک، نرمی، سادگی اور نشریت سبب

کچھ ہے لیکن قدیم ہندو کلچر کو شعوری طور پر شعر میں گھسیٹنے کی کوشش اور غیر مانوس و ثقیل سنسکرت الفاظ کی بے محل شمولیت سے ان کی رُباعیوں کی لطافت بعض جگہ مجروح ہوگئی ہے۔ فراقؔ کی رُباعیوں کے معنوی و لفظی خصوصیات کو سمجھنے کیلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود فراقؔ کے دیباچے سے چند فقرے نقل کئے جائیں۔ فراقؔ اپنی رُباعی کو ہندوستانیت بردوش شاعری سے مربوط کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''جہاں تک ایسی شاعری کا تعلق ہے جسے ہم صحیح معنوں میں ہندوستانی کہہ سکیں جس میں وہ مخصوص احساس حیات و کائنات ہو جو کہ رگ وید سے لے کر تلسی داس اور سور داس اور میرا بائی کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جو اس زمانہ میں بھی ٹیگور کے نغموں کے پنکھڑیوں کی آبیاری اور شادابی کا باعث ہے''۔

''میں ہندوستان اور ہندوستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندہ رگوں کو چھولینا چاہتا تھا...... اردو کو سنسکرت اور ہندی شاعری دونوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے...... ان رُباعیوں میں میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ موقع موقع سے نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آئے...... یہ رُباعیاں سب کی سب جمالیاتی سنگھارس کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں شاعری کے وہ افادی پہلو نظر نہ آئیں گے جن کیلئے ہم بے صبر رہتے تھے...... ان رُباعیوں میں محض ہندو کلچر کا خمیر نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ آفاقی کلچر کے عناصر بھی ان رُباعیوں کے سامان آرائش ہیں''۔

لیکن ان کی رُباعیوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فراقؔ نے سنسکرت الفاظ کو اردو میں استعمال کرنے میں احتیاط نہیں برتی۔ اکثر جگہ الفاظ و تراکیب، فصاحت پر بار ہیں بعض جگہ معنوی ژولیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اردو خواں طبقہ اُسے سمجھ ہی نہیں سکتا، قدیم ہندو ثقافت و معاشرت کو رُباعیوں میں بعض جگہ ایسی بے اعتدالی سے شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ

Scanned with CamScanner

شعریت و غزلیت کا خون ہوگیا ہے۔ فراقؔ نے بعید از قیاس استعارات و کنایات، تشبیہات و تلمیحات کا بھی اکثر استعمال کیا ہے اور ان کی اس کوشش نے ان کی شاعری کے لطیف پہلو کو شدید ضرب لگائی ہے۔ چند رُباعیاں دیکھئے:

یہ روپ مدن کے بھی خطا ہوں اوسان
یہ سچ جو توڑ دے رتن کا ابھمان
پھیکی پڑتی ہے دھوپ یہ جوبن جوت
یہ رنگ کی آنکھ کھول دے جیون جان

....

مدھوبن کے بسنت سا سجیلا ہے وہ رُوپ
برکھا رُت کی طرح رسیلا ہے وہ رُوپ
رادھا کی جھپک، کرشن کی برزوری ہے
گوکل نگری کی رس لیلا ہے وہ رُوپ

....

کرونٹرا اس کی سریلی کوتاہ ہے بن میں
اُٹھتے ہوئے درد کا ترانہ ہے بدن میں
رادھا کے آنسوؤں کے ملتے ہوئے تار
کل گوپیوں کے برہ کی بیڑہ ہے بدن میں

اس طرح کی درجنوں رُباعیاں فراقؔ کے مجموعے میں شامل ہیں۔ ان رُباعیوں کے اکثر مصرعے، الفاظ و ترکیبیں سنسکرت آمیز ٹھیٹ ہندی ہیں اور اردو سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ان رُباعیوں کا مفہوم جیسا کہ اکثر ناقدین نے اس کا اظہار کیا ہے جب تک فراقؔ صاحب خود بیان نہ کریں عام طور پر لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ بعض الفاظ کے معنی حاشیہ پر انہوں نے درج ضرور کر دیئے ہیں لیکن یہ بھی شعر کی تہہ تک پہنچنے میں مدد نہیں دیتے۔ ان کی مذکورہ بالا طرز کی رُباعیاں فی الواقع بے روح و بے کیف ہیں۔ ان رُباعیوں کی زبان اردو شعر کی زبان نہیں ہے۔

اس روش کے برعکس جہاں فراقؔ نے ہندو کلچر کو زبردستی شعر میں داخل کرنے کی لاحاصل کوشش نہیں کی۔ وہاں انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ان کی اکثر رُباعیاں فراقؔ کی غزلوں کی طرح ان کے انفرادی عشقیہ مزاج کی سچی ترجمان بن گئی ہیں۔ وہ غزلوں کی طرح رُباعی میں بھی فطرت کے پیکر سادہ سے حسن پرکار کے رنگا رنگ پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

معاملاتِ محبت کی شاعرانہ تعلیل، فطرت عشق کی ترجمانی اور حسن مجسم کی جزئیات نگاری میں انہیں غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے۔ وہ محبوب کے خدوخال کا اس قدر تفصیل و حسن کاری سے ذکر کرتے ہیں کہ اکثر محبوب کو مجسم لا کھڑا کر دیتے ہیں اور رُباعی نگاری میں مصوری کی سی شان پیدا کر دیتے ہیں لیکن سراپا نگاری، لکھنوی شعراء کی طرح صرف حسن خارجی اور اس کے لوازم کے بے کیف مجموعے کا نام نہیں بلکہ ان کی نفسیاتی بصیرت، شاعرانہ فطانت اور حیات خیز رومانیت، محبوب کے عضو کا ذکر کر کے حسن فطرت کی لطف اندوزی و لذت کشی کیلئے ایسی باطنی شائستگی پیدا کرتی ہے جو خواہشِ نفسانی کو باغی یا بے لگام نہیں ہونے دیتی۔ فراقؔ کی رُباعیوں میں محبوب اور اس کا حسن صرف مجسم ہو کر نہیں بلکہ رقص کرتا ہوا سامنے آتا ہے گویا ان کے بیانِ حسن میں صرف تجسیم نہیں بلکہ ایک قسم کی تحریک بھی ہے زندگی کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی روح کو چھو لیتی ہے۔

فراقؔ کی رُباعیوں میں محبوب کے زلف، لب، رُخسار، قد، آنکھ اور چال کے ذکر میں تکرار بھی نظر آئے گی لیکن نئی تشبیہوں کے استعمال اور تخیل کی گل کاریوں کی مدد سے فراقؔ نے ان میں وہ جان ڈال دی ہے کہ اس یکسانگی میں بھی ایک طرح کا تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ چند رُباعیاں دیکھئے:

ابرو ہلتے ہیں یا لچکتی ہے کٹار
یہ رُوپ کہ رحمتوں کی جیسے چمکار
یہ لون یہ دھج یہ مسکراہٹ یہ نگاہ
یہ موج نفس کہ سانس لیتی ہے بہار

....

ساغر کف دست میں صراحی بہ بغل
کاندھے پر گیسوؤں کے کالے بادل
یہ مد بھر آنکھیں نگاہیں چنچل
ہے پیکر ناز کے حافظؔ کی غزل

....

وہ نکھرے بدن کا مسکرانا ہے ہے
اس کے جوبن کا گنگنانا ہے ہے
کانوں کی لوؤں کا تھرتھرانا کم کم
چہرے کے تل کا جگمگانا ہے ہے

Scanned with CamScanner

....

مکھڑا وہ دیکھیں تو ماہ پارے چھپ جائیں
خورشید کی آنکھ کے شرارے چھپ جائیں
رہ جانا وہ مسکرا کے تیرا کل رات
جیسے کچھ جھلملا کے تارے چھپ جائیں

....

منڈلاتا ہے پلک کے نیچے بھونرا
گلگوں رُخسار کی بلائیں لیتا
رہ رہ کے لپک جاتا ہے کانوں کی طرف
گویا کوئی رازِ دل ہے اس کو لینا

....

کس بادہ سے چور ہے جوانی تیری
کن شعلوں کا نور ہے جوانی تیری
جیسے جوالا مکھی ہو پھٹنے والا
کتنی بھرپور ہے جوانی تیری

....

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لیتی ہے
دُکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

....

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ رُوپ یہ لوچ یہ نرمی یہ نکھار
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

....

بالوں میں خنک سیاہ راتیں ڈھلتیں
گالوں کی شفق کی اوٹ میں شمعیں جلتیں
تاروں کی گھنی چھاؤں میں بستر سے
اک جان بہار اُٹھتی ہے آنکھیں ملتی

....

اُوپر دی ہوئی رُباعیاں، وہ رُباعیاں ہیں جن کا تعلق ''شرنگارس''، یعنی سامنے کی گوشت پوست والی دنیا کے جمالیاتی احساس کی ترجمانی سے ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے ناقدین نے

Scanned with CamScanner

عموماً فراقؔ کے اسی رنگ کو سامنے رکھ کر ان کی رُباعیوں کی شعری قدر و قیمت اور اہمیت کا اعتراف کیا ہے، لیکن محض جمالیاتی احساس کے حوالے سے فراقؔ کی رُباعیوں کو سب کچھ سمجھنا درست نہیں ہے۔ ان کی رُباعیوں میں سماجی و سیاسی مسائل اور زندگی کے روزمرہ کے حقائق کا عکس بھی جگہ جگہ ملتا ہے اور ایسی حسن کاری کے ساتھ کہ ہم فراق کو بہر صورت ایک بڑا رُباعی نگار کہیں گے۔ بطور مثال چند رُباعیاں دیکھیے۔

....

اے مغنیِ کائنات مجھ میں آ جا   اے رازِ صفات و ذات مجھ میں آ جا
سوتا سنسار جھلملاتے تارے   اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آ جا

....

اک دن شاعر حریم قدرت میں گیا   سربستہ مشیتوں کو جانچا پرکھا
اور ان میں آخری مشیت یہ تھی   آدم کا مشیتوں پہ قابو پانا

....

قبل اس کے کہ ہو فیصلہ خیر و شر   جینے کا ثبوت دے زمانے کو بشر
بے حس کردار نیک سے موت بھلی   نامراد اخلاق سے جرائم بہتر

....

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں   صدیوں بیدار رہ کر سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کہ ہوں خلوت میں فراقؔ   تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

....

اب آخر میں ایک رُباعی ایسی بھی سن لیجیے جس میں زندگی، زندگی کے فلسفے، معراج شعور انسانی اور اس کی شاعرانہ ترجمانی کا کمال ہنر سمٹ آیا ہے، اس کے جلو میں آپ کو حالیؔ، اکبرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، امجدؔ، جوشؔ اور یگانہؔ سب کی رُباعیوں کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے گا اور انسان کے تعلق

Scanned with CamScanner

سے حیات و کائنات اور خالقِ کائنات کے وہ سارے رشتے یکجا و متحرک محسوس ہوں گے جس سے فراق کی، صرف رُباعیاں ہی نہیں بلکہ پوری شاعری عبارت ہے۔ رُباعی یہ ہے:

کرتے نہیں کچھ کام تو کرنا کیا آئے
جیتے جی جان سے گزرنا کیا آئے
رو رو کے موت مانگنے والوں کو
جینا نہیں آ سکا تو مرنا کیا آئے

....

Scanned with CamScanner

فراق گورکھپوری اور نیاز و نگار

فراق اور نیاز کے تعلقات کی نوعیت، جوش اور نیاز کے تعلقات سے بالکل مختلف رہی۔ زیرِ نظر کتاب میں کئی جگہ اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ فراق گورکھپوری کی فتح پور اور فتح پور کے علم دوست کائستھ خاندان سے قرابت داری اور خاندانی رشتہ داری تھی، ان کی دو بہنیں فتح پور میں بیاہی تھیں اور جس خاندان میں بیاہی تھیں، نیاز فتح پوری اُس خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی علم دوستی اور ادب نوازی کے تعلق سے فراق کیلئے شروع ہی سے ایک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس نرم گوشے کے ثبوت، نیاز کی کئی تحریروں سے ملتے ہیں۔

۱۹۴۱ء میں نیاز نے نگار کا خاص نمبر نکالا۔ اسے ہم عصر اردو شعراء کی خودنوشت کہنا چاہئے۔ اس میں فراق کے بارے میں لکھا

''فراق کی شاعری کے متعلق میں بہت بلند پایہ رائے رکھتا ہوں جس کا اظہار میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے کر چکا ہوں۔ فراق ایک نقاد شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق کی شاعری، پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اُس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے''۔

نیاز نے فراق کے بارے میں اپنے جس مستقل تنقیدی مضمون کا اُوپر ذکر کیا ہے وہ ان کی تنقیدی تصنیف انتقادیات میں شامل ہے، ''انتقادیات'' اوّل اوّل دو حصّوں میں الگ الگ نگار اکیڈمی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ حصّہ اوّل و حصّہ دوم، ہر ایک میں چھوٹی تقطیع کے کم و بیش چار سو صفحات تھے۔ حصّہ اوّل کی متوقع اشاعت کا اولین اشتہار جنوری فروری کے سالنامہ ریاض خیرآبادی نمبر بابت جنوری فروری ۱۹۴۳ء میں نظر آتا ہے۔ البتہ نومبر ۱۹۴۴ء کے شمارے میں انتقادیات حصہ اول و دوم دونوں کی متوقع اشاعت کا اشتہار دیا ہوا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے شماروں میں دیا ہوا اشتہار بتاتا ہے کہ یہ کتابیں دراصل ۱۹۴۵ء میں طبع ہوئی ہیں۔ کتابیں مجلد تھیں لیکن کاغذ

Scanned with CamScanner

بہت خراب تھا۔ فی جلد چار اور پانچ روپے تھی۔

یہ تفصیل یوں لکھنی پڑی کہ نیاز صاحب نے ان کتابوں میں سال اشاعت درج نہیں کیا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر اب تک ان کتابوں کے کتنے ایڈیشن نکلے، یہ بتانا بھی مشکل ہے البتہ ان کے قبول عام میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ نیاز کی ان کتابوں سے سبھی واقف ہیں اور پاک و ہند کی مختلف جامعات نے اُردو کے اعلیٰ نصابوں میں اُنہیں شامل کر رکھا ہے۔

پاکستان سے دونوں کتابوں کا ایک انتخاب ''انتقادیات'' ہی کے عنوان سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ یہ بھی کمیاب ہے بلکہ برسوں سے نایاب ہے۔ اس نایابی کے سبب انتقادیات کی دونوں قدیم مکمل جلدیں یعنی حصہ اوّل و دوم بیک وقت از سر نو اتو مار پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۵ء میں خاص اہتمام سے شائع کر دی ہیں لیکن نیاز کا مضمون، انتقادیات میں شامل ہونے سے پہلے مئی ۱۹۳۷ء کے نگار میں ''یو پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر فراق گورکھپوری'' کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ اس کے بعد فراق کو وہ شہرت و مقبولیت ملی کہ اُن کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہونے لگا۔

نیاز فتح پوری فراق گورکھپوری کو بحیثیت غزل گو شاعر کس حد تک پسند کرتے تھے اور اردو غزل گوئی کی تاریخ میں اُنہیں کیا مقام دیتے تھے اور کن دلائل کے ساتھ دیتے تھے اس کیلئے تو فراقؔ کے بارے میں نیاز کا پورا مضمون دیکھنا ہوگا ویسے محض ان کی مختصر رائے جاننا مقصود ہو تو ان کے مضمون کی چند سطور دیکھتے چلیے، یہ سطریں نیاز کی رائے کی تلخیص ہیں۔

> دورِ حاضر اس میں شک نہیں ترقی سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیت انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے سخن گو نظر آ رہے ہیں لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حالات سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر دوں تو میری زبان سے فوراً فراق گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔
>
> فراقؔ جن کا نام رگھو پتی سہائے ہے۔ گورکھپور کے رہنے والے ہیں اور ہر چند اردو شاعری

Scanned with CamScanner

کا ذوق انہیں وراثتاً ملا ہے لیکن ان کا مخصوص ''رنگِ سخن'' خود انہی کی ذاتی چیز ہے جس کے ابتدائی نشو ونما یا تدریجی ارتقاء پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا کیونکہ میں ان کے ابتدائی حالات سے بالکل ناواقف ہوں۔

میں نے اوّل اوّل ان کو یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جبکہ وہ گریجویٹ ہو چکے تھے اُس کے بعد کانپور کے سناتن دھرم کالج سے تعلق پیدا کر لیا اور وہیں سے وہ انگریزی ادب میں ایم۔اے کی سند حاصل کر کے الہٰ آباد یونیورسٹی چلے گئے۔

لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص غیر معمولی ذہین ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے اور دوسرا ایسی متزلزل چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کیلئے کافی ہے لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے بچ گئے اور اب اُنہیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

لکھنؤ میں جب کبھی مجھے ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، میں نے ان کے ذوق کی پاکیزگی کو بین طور پر محسوس کیا، لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ مستقبل میں اس فن کو کس حیثیت سے اختیار کریں گے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے فراقؔ کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اس وقت یہ معلوم کرنا چاہیں کہ فراقؔ کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

ان کا میلان وہی ہے جو مصحفیؔ کا تھا جس رنگ کو لیا اپنا لیا اور ذہن و بیقرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے علی الخصوص اس وقت جب فطرت کے ساتھ ساتھ ان کا اکتساب بھی کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم بہ لحاظ اندازِ بیان اگر ان کو ''مومنؔ اسکول'' میں شامل کیا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔

میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ شاعر کیلئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے۔ پھر چونکہ فراقؔ کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے ''قدرِ اوّل'' کا مرتبہ نہ دیا جائے۔

Scanned with CamScanner

یہ بالکل درست ہے کہ فراق کے کلام میں اسقام بھی پائے جاتے ہیں یعنی نہ وہ فنی غلطیوں سے یکسر پاک ہے اور نہ بیان کی ژولیدگیوں سے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاعرانہ روح ان کے ہر ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ مخصوص والہانہ انداز جو غزل کی جان ہے کسی جگہ ہاتھ سے چھٹنے نہیں پاتا۔

فراق اب شاید مشاعروں کی طرحوں پر بھی غزلیں لکھتے ہیں اور فرمائشی شعر گوئی، کیلئے بھی تیار ہوجاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مشق سخن کیلئے یہ طریقہ کارمفید ہو لیکن شاید پاکیزگی سخن کا اقتضا کچھ اور ہے چنانچہ جس وقت ہم فراق کی طرحی وغیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مغنی کی وہ حیثیت جب وہ تنہائی میں بیٹھ کر صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کیلئے گنگناتا ہے، اس حیثیت سے بہت مختلف ہوتی ہے جب اس کا مقصود صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری کیلئے کیسا نرم گوشتہ رکھتے تھے اور ان کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کے کیسے معترف تھے، اس کا پورا اندازہ نیاز کی اُن سطور سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو اُوپر درج کی گئی ہیں یہی نہیں ایک اور رُخ سے بھی سراغ لگتا ہے کہ نیاز فتح پوری نے فراق کو اُن کے ہم عصرو ہم عمر شعراء پر ہمیشہ ترجیح دی ہے اور جدید غزل گو کی حیثیت میں فراق کو منفرد جانا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نگار کے کالم مالہ اور ماعلیہ میں اگرچہ معاصرین پر بہت کڑی اور شدید تنقیدیں کی ہیں لیکن فراق کو بہت سی رعایتوں کا مستحق جانا ہے اور سخت سخت لہجے میں بھی اپنائیت اور نرم خوئی کو حاوی رکھا ہے۔

اس جگہ، ذہن میں ایک سوال یہ اُبھر کر آتا ہے کہ فراق گورکھپوری کی نگاہ میں نیاز کا کیا منصب ومقام تھا؟ اس کے جواب کیلئے فراق کی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی جملہ تحریروں کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں اس کیلئے فراق کا صرف وہ خط دیکھ لیجئے جو اُنہوں نے ۱۹۶۳ء میں مجھے اس وقت لکھا تھا جب کہ میں نگار کا نیاز فتح پوری نمبر نکال رہا تھا اور فراق سے نیاز کے بارے میں مضمون لکھنے کی گزارش کی تھی۔ فراق اپنی علالت کی وجہ سے نیاز کے بارے میں کوئی بھرپور مضمون تو نہ لکھ سکے البتہ میرے خط کے جواب میں بصورت نثر ونظم اُنہوں نے مجھے جو کچھ لکھ کر بھیجا، وہ نیاز سے ان کی

Scanned with CamScanner

عقیدت کا بھرپور پتہ دیتا ہے۔ آپ بھی یہ خط نیاز نمبر کے سلسلے میں ان کے نثر و نظم کے ساتھ دیکھتے چلیے۔

آشفتہ بیانی میری

مجی فرمان،

اب سے ہفتہ بھر پہلے شاید آپ کو میرا کارڈ مل گیا ہو حسب وعدہ نثر کے یہ چند سطور اور چند اشعار ''نگار پاکستان'' کے نیاز نمبر کیلئے حاضر کر رہا ہوں۔ مجھے حضرت نیاز کی عظمت کے متعلق براہ راست جو کچھ کہنا تھا وہ نثر میں عرض کر دیا۔ یوں تو اس سے بہت زیادہ کہہ سکتا تھا لیکن صحت کی معذوریاں مانع ہوئیں۔ نظم کے جو اشعار ہیں وہ صرف اس امید سے بھیج رہا ہوں اور وہ بھی ڈرتے ڈرتے کہ شاید انہیں پڑھ کر پاکستان میں نو وارد حضرت نیاز کا دل ذرا شگفتہ ہو۔ یہ اشعار بستر علالت پر پڑے پڑے بے ترتیبی سے ذہن میں آتے گئے اور میں اُسی بے ترتیبی سے انہیں لکھتا گیا ان میں کوئی منطقی تسلسل نہیں ہے جو بات انہیں پوری اکائی بنا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام اشعار ایک زمین میں ہیں اور شاید ہر شعر میں میرے مختلف اسالیب میں سے میرا ایک خاص اسلوب اور لب و لہجہ جھلک رہا ہو۔ ان کی داد حضرت نیاز سے نہ ملے گی تو کس سے ملی گی اور اگر ان میں سے کچھ اشعار حضرت نیاز کو خوش نہ کر سکیں گے تو پھر کسے خوش کر سکیں گے۔ حضرت نیاز سے میرا بہت بہت سلام کہئے گا۔

چند اشعار ہونے کے بعد جو شعر بھی ہوتا تھا وہ گویا حضرت نیاز کی حضوری میں ہوتا تھا اس سے زیادہ میں اور کیا کہوں۔

آپ کا فراق

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرے مخلص و مکرم حضرت نیاز فتح پوری لکھنؤ سے چلے گئے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ انہیں الوداع کہتا اور دائمی جدائی سے پہلے اُنہیں ایک بار دیکھ لیتا۔ یوں تو جب وہ یہاں تھے بہت طویل وقفوں کے بعد کبھی کبھی ان کے یہاں جا کر اُن کے درشن کر لیتا تھا لیکن یہ تو اطمینان تھا کہ وہ قریب ہی ہیں۔ مجھے اپنا ہی شعر یاد آ گیا۔ یہ سوچ کر کہ اب حضرت نیاز ہم سے دور اور بہت دور ہو گئے:

Scanned with CamScanner

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

خیر یہ قربت و دوری تو ایک مسلسل اور پیچیدہ اور نا قابلِ حل مسئلہ حیات ہے۔آپ کے متعدد خطوط ''نگار پاکستان'' کے نیاز نمبر کے سلسلہ میں ملتے رہے اور میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کر رہ جاتا تھا کہ طویل اور شدید علالت کے عالم میں اتنی بات کہاں سے لاؤں کہ اپنے محترم اور بزرگ اور سراپا خلوص و شرافت دوست حضرت نیازؔ فتحپوری کے متعلق اپنے خیالات کو قلمبند کروں۔یوں بھی کچھ لکھوانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ایک بہت بڑے مکان میں بے آل و اولاد اور بے رفیقہ حیات چارپائی تھامے پڑا ہوں۔یار و مددگار بھی کبھار میری تنہائی کا ہاتھ بٹا جاتے ہیں۔

حضرت نیازؔ کی زندگی اور ان کے کارنامے نا قابل فراموش چیزیں ہیں۔کس آنکھ کی مجال ہے کہ جو اُنہیں نظر انداز کر سکے۔وہ ہمارے ادب اور تہذیب کے قطب مینار ہیں۔میں قریب قریب ستر برس کی عمر میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اُن کی تحریروں سے اُردو سیکھی ہے اور ان کا رسالہ ''نگار'' چالیس برسوں سے میرے لئے ایک فیض گاہ درس گاہ رہا ہے میرا ناچیز ادب حضرت نیازؔ کے ادب سے بہت مختلف ہے لیکن اس کے تخلیق و تعمیر میں حضرت نیازؔ کی تحریریں بہت ممد و معاون و موثر قوت کا کام کرتی رہیں ہیں۔میں تو یہ کہوں گا کہ جو ادیب معتقد نیازؔ نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے یعنی

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

ایک بہت بڑی بات جو ان کے اعلیٰ ترین ادبی خدمات کے علاوہ حضرت نیازؔ میں مجھے نظر آئی وہ ان کی روشن خیالی بے تعصبی ہے ان کے حریف جو بھی کہیں لیکن میں بانگ دہل کہوں گا کہ حضرت نیازؔ مسلمان ہیں لیکن کیسے مسلمان ہیں؟ ایک ایسے مسلمان جس کے اسلام پر ہندو دھرم بھی ناز کرے۔خود میں بھی یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میرے ہندو دھرم کے سر پر دنیا کے تمام پیغمبروں اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کے دستِ شفقت کا سایہ ہے۔میں نے حضرت نیازؔ کو ایک ایسا

Scanned with CamScanner

مسلمان پایا جو انسان دوستی کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے۔ حضرت نیازؔ کی شخصیت و کردار میں عقلیت غالب عنصر ہے۔ میرے مزاج میں عقلیت مابعد الطبیعات و تصوف یا دیدانت کا امتزاج رہا ہے۔ اگرچہ محض حال وقال کا غلبہ مجھ پر کبھی نہیں رہا لیکن حضرت نیازؔ کی روشن خیال عقلیت پر میں تمام ان وجدان زدہ ہندو مسلمانوں کی طبعی فرقہ پرستی کو ترجیح دیتا ہوں جو حال وقال کا بھی ثبوت دیتے ہیں اور اپنے سے دوسرے فرقہ والوں سے غیریت کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ حضرت نیازؔ کی ''من ویزداں'' نے ایک شریفانہ و تہذیب یافتہ اور ہمہ گیر اسلام کو پیش کیا ہے۔ جس سے کسی غیر مسلم کو بھی اختلاف کرنا ذرا آسان نہیں ہے۔ یہی مولانا روم کا اسلام تھا۔ یہی صوفیوں کے تمام سلسلوں کا اسلام رہا ہے اور یہی فارسی کی بلند ترین شاعری کا پیغام ہے۔

حضرت نیازؔ پر ایک نہایت قابل قدر مفکر، مقالہ نگاہ، صحیفہ نگار، فسانہ نگار، نقد و تبصرہ نگار اور ایک بلند پایہ اسٹائلسٹ (Stylist) کی حیثیت سے اگر اختصار سے بھی لکھا جائے تو وہ ایک دفتر ہو جائے گا۔ بیماری میں اتنی سکت کہاں سے لاؤں؟ تین چار ماہ کی علالت میں دس پانچ دن ایسے بھی گزرے کہ چند غزلیں ہوگئیں جن کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میرا مخصوص مذاق و وجدان اپنی آخری حدیں ان غزلوں میں چھوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ علالت نے میری طبیعت کی فطری گھلاوٹ میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور میری شاعری ان غزلوں میں اپنی انتہائی منزلوں کی جھلک دکھا رہی ہے لیکن ''نیاز نمبر'' کیلئے یہ غزلیں کیا دیں گی۔ البتہ ایک ایسی غزل اس علالت میں ہونے لگی جو ایک قصیدہ کی تشبیب کی صورت پکڑتی گئی اور جس کے متعدد اشعار پر غالباً عرفی اور مرزا بیدل کی پرچھائیاں ان کی آوازوں کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ ہندو پاک میں حضرت نیازؔ ان انے گنے لوگوں میں ہیں عرفی اور مرزا بیدل کے کلام کے خاص جانکار اور قدر شناس ہیں۔ شاید اس لئے اس خط کے ساتھ اشعار کی شکل میں جو اپنے افکار پریشاں بھیج رہا ہوں نہایت موزوں و مناسب ہوں گے کیونکہ حضرت نیازؔ ان اشعار کو اپنے لئے ایک پسندیدہ نذر و تحفہ سمجھیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ ان کے بلند مذاق شعری کی داد ان اشعار میں دی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

یہی سوچ کر جب یہ کئی اشعار موزوں ہو چکے تو آخیر میں میں نے یہ شعر مہر کی طرح ثبت کر دیا۔

مری یہ نذر عقیدت سرِ قدوم نیازؔ

صبا کے دوش پر پہونچے بصورتِ اشعار

جو اشعار بھیج رہا ہوں وہ اس موقعہ کیلئے غالباً اس لحاظ سے نہایت موزوں سمجھے جائیں گے کہ اگر میرے اشعار حضرت نیازؔ کے متعلق ہوتے تو پسندیدہ ہوتے لیکن چونکہ حضرت نیازؔ کے ا پ دئے ادبی مذاق کے عین مطابق یہ اشعار ہیں اس لئے صحیح معنوں میں انہیں پھولوں کا ایک تحفہ یا نذرِ عقیدت سمجھا جا سکتا ہے اور بجائے پسندیدہ ہونے کے انہیں پسندیدہ تر خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناچیز خدمت شاید اس لئے کسی قابل سمجھی جائے کہ ان اشعار کو پڑھ کر حضرت نیازؔ وجد کریں گے۔ کسی قابل قدر ہستی کو عین اس کے وجدان و مذاق کے مطابق اشعار سنا کر وجد میں لانا کیا ثبوتِ خلوص نہیں ہے؟ کہنے کو تو ہو گیا کہ اس یادگار موقع پر فراقؔ نے ایک ایسا تحفہ حضرت نیازؔ کی خدمت میں پیش کیا جو حضرت نیازؔ کو پسند آیا۔

آخیر میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ مجھ جیسے ہندوستان میں حضرت نیازؔ کے ہزار ہا نام لیوا دل سے یہی چاہیں گے کہ پاکستان میں ان کا قیام واقعی انہیں راس آئے اور ان کی مردانہ وار و شاندار زندگی کے آخری دن ایسوں میں کٹیں جو اپنے پیار و محبت سے، خدمت و احترام سے حضرت نیازؔ کو خوش رکھیں۔ یوں تو نیازؔ کی زندگی بڑی بے نیاز زندگی ہے۔

کہیں یہ قافلہ صبح کے نہ ہوں آثار

سرِ افق شبِ غم اڑ رہی ہے بن کے غبار

مری صدا ہے گھنا سایہ وقت نصف نہار

بوقت شب مری آواز روشنی کا منار

دیارِ دل کے یہی ہیں علامت و آثار

تمام دشتِ جنوں ہے، تمام شہر نگار

Scanned with CamScanner

نشانِ منزلِ عبرت ہر ایک راہگذار
ہر ایک نقش قدم لاکھوں سرتوں کا مزار

خیالِ زلفِ سیہ سے گھٹائیں چھانے لگیں
دھواں سا اٹھنے لگا دیکھنا سر کہسار

کسی کی چشم سیہ کے پیام لائے ہیں
یہ میگھدوت جو منڈلا رہے ہیں سلسلہ وار

یہ جوگنیں سی کمنڈل لئے جو آئی ہیں
ان انکھڑیوں کا پتہ کام روپ یا تاتار

یہ امتزاجِ صفتہائے قربت و دوری
بدن تمام گریز و تمام بوس و کنار

جو انگلیاں کبھی رکھ دی ہیں نبضِ دوراں پر
پتہ چلا کہ فضاؤں کو آگیا ہے بخار

ارے یہ اہل سیاست ہیں، ہم جو کہتے ہیں
وہی کریں گے یہ بعدِ از خرابی بسیار

Scanned with CamScanner

ہے ایسوں ہی سے خدا واسطے کا بیر مجھے
عوام کے جنہیں دکھ سکھ سے نہیں سروکار

ہم اور کچھ نہیں کہتے مگر یہ کہتے ہیں
کہ آدمی کے نہ بس میں ہو آدمی زنہار

حریف ابلقِ گردوں کی باگ موڑ چکے
یہاں ہنوز وہی ذکرِ چرخِ کجرفتار

کچھ اور چاہیے خدماتِ خارجی کے سوا
کہ زندگی کو ہے اے دوست زندگی درکار

یہ پالنا ہے تو کہتے ہیں مارنا کس کو
سنا تو ہے کہ کوئی ہے جگت کا پالن ہار

یہ رات اور یہ گرداب اور یہ طوفاں
درست لنگر کشتی و ناخدا بیدار

رہے گا معرکۂ زیست تا بکے جاری
کہ ٹوٹتی ہی نہیں ہے یہ خیر و شر کی قطار

Scanned with CamScanner

عجیب ملزمِ روزِ حساب ہوں یارب
ثواب سے بھی ہوں منکر گنہ سے بھی انکار

یہ انتشارِ جہاں ہے جہانِ نو کا نقیب
غبارِ راہ گذر میں نہاں ہے کوئی سوار

وہاں بہ گردشِ وجدانِ ذکر جاری ہے
جہاں ہیں حلقۂ موہوم سبحہ و زنار

یہ سحر کاری فن ہے کہ ہے کرشمہ چشم
مرے سخن کی دمک ہے تابشِ رخسار

یہ یک نگاہ مٹا دے بنا بھی دے مجھ کو
چہ خوش بود کہ بر آید بہ یک کرشمہ دوکار

جو صاف گردشِ دوراں کی زد سے باہر تھے
تری نگاہ اڑا لے گئی وہ لیل و نہار

مری نوا میں ازل کا ترنمِ سحری
مری صدا میں ابد کے سکوت کی جھنکار

Scanned with CamScanner

ورائے کیف و اثر تھا فشردہ انگور
عجیب حال مرا ہے کہ نشہ ہے نہ خمار

کل آئی رات گئے تیری یاد یوں مجھ کو
گماں ہوا کہ کہیں دور بج رہا ہے ستار

یہ کس کے غم میں فضائیں تھیں جامد و ساکت
یہ کس کی یاد سے چلنے لگی ہے بادِ بہار

مرے ہی دل کی ہیں کچھ دھڑکنیں زمان و مکاں
مرے ہی غم کے شرارے ثوابت و سیار

اثر سے فکر غزل کے گھٹا سی چھانے لگی
شعور پر لگا منڈلانے ابر گوہر بار

بس ایک ساز شکستہ ہوں خاک آلودہ
بڑھا دیا مرے نغموں نے زندگی کا وقار

بہت زمانہ ہوا قیس کو مگر اب بھی
نواحِ نجد میں اڑتا ہے ناتواں سا غبار

Scanned with CamScanner

مجھے سکوتِ فضا میں گماں ہوا اکثر
کہ جیسے دوست کرے دوست سے کوئی اقرار

جلا رہا ہوں میں بچ بچ کہ یہ چراغِ سخن
کہ پھونک دے نہ مجھے میری گرمئ افکار

یہ زخمِ دل کی نمائش یہ طرزِ خود رحمی
کچھ اس سے بڑھ کے ہے سنجیدگیٔ غم درکار

ان انگلیوں نے جو اک ساز چھیڑ رکھا ہے
یہ مہروماہ یہ تارے اسی کی ہیں جھنکار

لبوں سے وقتِ شہادت کرن سی پھوٹتی ہے
حیاتِ نو کی بشارت ہے نغمہ سردار

کریں شرافت و اخلاق جس کی خود تعظیم
وہ میں ہوں روسیہ و بدسرشت و بدکردار

جمالِ یار خود آگاہ ہوگیا بارے
بڑا یہ کام کیا تو نے اے دلِ خوش کار

Scanned with CamScanner

معانقہ بھی بس اک پہلوے تلاشِ جمال
مشاہدہ بھی بس اک دیدِ انتظار آثار

ہنوز ہوش نما غفلتوں کے جھونکے ہیں
یہ زندگی بھی ہوئی کیسی نیند سے بیزار

وہاں سے بول رہا ہوں جہاں کہ میں بھی نہیں
تمام عالمِ ہنوز از کنارتابہ کنار

ہوا زمانے کی جس کو نہ چین لینے دے
ہم اس کو زندگی سمجھیں کہ کوئی مشتِ غبار

فراقؔ ہوش میں ہے اب تو اک مدّت سے
اتر سکا نہ مگر تیری دوستی کا خُمار
یہ میری نذرِ عقیدت سرِ قدوم نیازؔ
صبا کے دوش پر پہونچے بہ صورتِ اشعار

علامہ نیاز فتح پوری کے بارے میں فراق گورکھپوری کے مندرجہ بالا مضمون اور قصیدہ نما اشعار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فراق گورکھپوری نیاز کو کس قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دونوں میں کس نوع کا تعلقِ خاطر تھا یوں لگتا ہے کہ علامہ نیاز کی نظروں میں اُنیسویں صدی کے اردو شعراء خصوصاً غزل گو شعراء میں جو مقام مومن خان مومن کا تھا وہی مقام بیسویں صدی کے غزل گو شعراء میں فراق گورکھپوری کا تھا۔

Scanned with CamScanner

فراق گورکھپوری سے سلسلۂ ملاقات و مراسلت

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، بھی علامہ نیاز فتح پوری کی طرح پہلی بار مارچ ۱۹۵۲ء میں الہٰ آباد (یو۔ پی، ہندوستان) سے کراچی (پاکستان) آئے اور راقم الحروف کی دعوت پر بین المملکتی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے۔ اس سے پہلے بھی بعض اداروں اور انجمنوں نے انہیں پاکستان بلانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ میری دعوت پر کراچی آنے کا ایک خاص پس منظر تھا اور پس منظر یہ تھا کہ ان سے میری نیاز مندی بہت پہلے سے تھی، میں جب ۱۹۴۶ء اور ۱۹۵۰ء کے عرصے میں فتح پور کے مسلم ہائی اسکول موجودہ مسلم انٹر کالج میں معلم اور بزم ادب کا نگراں تھا، فراق صاحب کو کئی بار اسکول کے مشاعرے میں بلا چکا تھا اور اس وسیلے سے ان سے ذاتی تعلقات بھی ہموار ہو گئے تھے۔

مسلم ہائی اسکول فتح پور کے مشاعروں میں بھی اُن کے بلائے جانے اور شرکت کرنے کا ایک خاص پس منظر تھا ایک تو یہ کہ فراق صاحب علامہ نیاز فتح پوری کا حد درجہ لحاظ کرتے تھے بلکہ نیاز کو اپنا محسن کہتے تھے اور برملا اعتراف کرتے تھے کہ سب سے پہلے نیاز نے مجھے پہچانا اور نگار میں میری شاعری کے بارے میں ایک گراں قدر مضمون لکھا، انہوں نے مضمون لکھ کر مجھے ادبی فضا میں اُچھال دیا اور مجھے معتبر بنا دیا۔ فتح پور سے انسیت اور تعلق خاطر کا سبب، فراق کیلئے ایک اور بھی تھا۔ فراق کائستھ تھے اور ان کی دو حقیقی بہنیں فتح پور کے مشہور کائستھ خاندان میں لالہ ایشور سہائے کے گھر بیاہی تھیں۔

لالہ ایشور سہائے فتح پور کے خاندانی رئیس تھے اور کائستھوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو موٹی اینٹ والوں کے نام سے مشہور تھا اس خاندان کے لوگ چونکہ اینٹوں کے پژاوہ لگانے کا کام کرتے تھے اور پتلی اینٹوں کے بجائے موٹی اینٹیں تیار کرتے تھے اس لئے اس نام سے مشہور ہوئے۔ یہ خاندان اپنے علم و فضل اور دولت و منصب کے اعتبار سے بھی نہایت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ لالہ ایشور سہائے اور ان کے خاندان کے بیشتر افراد مدرسہ اسلامیہ مسلم ہائی اسکول کے

Scanned with CamScanner

بانی مولانا سید ظہور الاسلام کے حلقہ ادارت میں شامل تھے۔خود ایشور سہائے مولانا کے پرستاروں میں تھے اور جیسا کہ مولانا حسن الدین خاموش نے اپنی تصنیف ''یادگار ظہور'' مطبوعہ خاموش پریس فتح پور ۱۹۲۴ء میں لکھا ہے کہ ''مولانا کے قدر دانوں میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا''۔

لالہ ایشور سہائے کے تین بھائی اور بھی تھے۔میجر رنجیت مان سنگھ، رام چند مان سنگھ اور رائے بہادر مان سنگھ، رائے بہادر مان سنگھ پہلے ہندوستانی تھے جو عہد برطانوی میں آئی۔جی۔پی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بہادر مان سنگھ سے میں کئی بار ان کی کوٹھی پر ملا ہوں۔ پولیس کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے مغربی جانب کچھ دور کے فاصلے پر اپنی عالیشان کوٹھی میں رہتے تھے۔میں ۱۹۶۲ء میں جب میں پہلی بار پاکستان سے فتح پور گیا تو ان سے بطورِ خاص ملا تھا لیکن جب دوبارہ گیا تو وہ رحلت کر چکے تھے۔

لالہ ایشور سہائے کے چھ لڑکے تھے، بسن مان سنگھ، بہادر مان سنگھ، دلیپ مان سنگھ، نریشور مان سنگھ، امر مان سنگھ اور سر ایشور مان سنگھ۔ یہ سب کے سب عربی فارسی کے عالم تھے اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی سے بھی خاص واقفیت رکھتے تھے۔سب مولانا سید ظہور الاسلام کے عقیدت مندوں میں تھے ایسے عقیدت مند کہ مولانا سید ظہور الاسلام کو ان کی علالت کے زمانے میں اپنی کوٹھی میں لے گئے ہر طرح ان کی خدمت کی، وہیں مولانا کا انتقال ہوا، انہیں کے گھر سے جنازہ اٹھا یہ سارے بھائی مولانا کے جنازے کو اپنے کاندھوں پر مزار تک لے گئے۔اس خاندان میں ابھی تک مولانا کے بعض ملبوسات، مخطوطات اور خطوط بطور تبرکات محفوظ ہیں۔

ایشور سہائے کے بیٹوں میں بہادر مان سنگھ اور دلیپ مان سنگھ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے بہنوئی تھے اور اسی تعلق سے فراق گورکھپوری مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے مشاعروں میں آسانی سے آجاتے تھے اور اسی توسط سے میری بھی فراق سے ملاقات تھی۔ دلیپ مان سنگھ عرف نپی لالہ نے الہٰ آباد یونیورسٹی سے ۲۳-۱۹۲۲ء میں ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی کیا تھا،

Scanned with CamScanner

امرناتھ جھا اور علی امیر، ان کے ہم جماعت تھے۔ میں ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ جب فتح پور گیا تو دلیپ مان سنگھ سے بطور خاص ملا تھا۔ بڑے خلوص سے پیش آئے تھے اور مولانا سید ظہور الاسلام کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بتائی تھیں جو میرے علم میں نہ تھیں۔ ان کی معلومات، مولانا ظہور الاسلام کے بارے میں اور فتح پور کے علاقے کے بارے میں بہت وسیع تھیں اس لئے کہ وہ ۱۹۱۲ء سے مسلسل اپنی ڈائری لکھتے تھے اس ڈائری میں ایک طرف فارسی میں اور دوسری طرف وہی باتیں انگریزی میں تحریر کرتے تھے۔

میں نے مولانا ظہور الاسلام پر جو پہلا مضمون لکھا تھا اور ۱۹۶۲ء میں میں نے جو شام ہمدرد کے جلسے میں پڑھا تھا اور جو بعد کو ماہنامہ ''ثقافت'' لاہور مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا اس کا زیادہ تر مواد میں نے دلیپ مان سنگھ کی ڈائری سے ہی حاصل کیا تھا۔ آخری مرتبہ جب میں فتح پور گیا تو معلوم ہوا کہ دلیپ مان سنگھ بھی انتقال کر گئے۔ گویا اب لالہ ایشور سہائے کے بیٹوں میں کوئی بھی حیات نہیں ہے ہاں ان کے خاندان کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اب بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں اور بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آج بھی یہ لوگ اپنے بزرگوں کی طرح سماجی و معاشرتی قومی خدمات میں حصہ لیتے ہیں چنانچہ آزادی کے بعد کانپور میں جو میڈیکل کالج قائم ہوا ہے اس کی عالیشان عمارت اسی خاندان کی بنوائی ہوئی ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس نے مجھے اپنے زمانہ طالبعلمی ہی میں فراق گورکھپوری کے قریب کر دیا، اسی قربت کے سبب میں نے انہیں مارچ ۱۹۵۲ء میں کراچی کے بین المملکتی مشاعرے میں مدعو کیا اور اسی مشاعرے کے بہانے ان سے کچھ دنوں خط وکتابت بھی رہی۔ میں نے اپنے خطوں میں فراق کو کیا لکھا، افسوس کہ وہ خط میرے پاس محفوظ نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ تو مکتوب الیہ کی امانت تھے اور کسی اور ہی کے پاس ہو سکتے ہیں۔ البتہ خطوط سے الگ میں نے فراق کے فکر وفن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مختلف رسالوں اور میری تنقیدی کتابوں میں موجود ہے۔ فراق

Scanned with CamScanner

کے تعلق سے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں مسلم ہائی اسکول فتح پور کے سالانہ مشاعروں اور ان میں فراق گورکھپوری کی شرکت کے حوالے سے ۱۹۴۸ء کا مشاعرہ میری زندگی میں یادگار رہے گا۔ اس مشاعرے کی صدارت علامہ نیاز فتح پوری نے کی تھی اور اثر لکھنوی و احسان دانش سمیت ہندوستان کے متعدد بڑے شاعروں نے اس میں شرکت کی تھی۔ اس وقت کے ابھرتے ہوئے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں فراق گورکھپوری کے دو خاص شاگرد تھے، تیغ الہٰ آبادی (بعد کو مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے) اور ڈاکٹر ابو محمد سحر دونوں الہٰ آباد یونیورسٹی کے طالبعلم تھے اور جہاں فراق جاتے تھے عموماً یہ دونوں ان کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ یہی ۱۹۴۸ء میں فتح پور کے مشاعرے میں ہوا، کسی باقاعدہ دعوت نامے کے بغیر، یہ دونوں مشاعرے میں شرکت کیلئے پہنچ گئے۔ مشاعرے کے بعد بوقت رخصت ان دونوں کے ساتھ کیسا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کی تفصیل سننے کے لائق ہے اور بہت دلچسپ ہے۔ ہر چند کہ اس کی تفصیل میں نے اپنے مضمون ''مطبوعہ نقش'' کراچی میں دیدی ہے پھر بھی قارئین کی معلومات اور دلچسپی کیلئے اسے مختصراً ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے

''دو ملاقاتیں ایک تیغ الہ آبادی سے دوسری مصطفیٰ زیدی سے''

مصطفیٰ زیدی سے بہت بعد کو واقف ہوا لیکن تیغ الہٰ آبادی سے میری شناسائی خاصی پُرانی ہے، آج سے پورے ۵۷۔۵۸ سال پہلے یعنی ۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور ''موجودہ انٹر کالج فتح پور'' کے زیرِ اہتمام ایک ''بزم ادب'' قائم تھی۔ اس بزم کی زیرِ نگرانی گاہے گاہے ادبی جلسے ہوتے تھے اور سردیوں کا پُورا ایک ہفتہ ادبی مشاغل کیلئے وقف کر دیا جاتا تھا۔ اس ہفتے کی آخری اہم تقریب کو ''سالانہ مشاعرہ'' کا نام دیا جاتا تھا۔ مشاعرہ کیا ہوتا تھا، سارے شہر اور آس پاس کے قصبات کیلئے ایک میلہ ہوتا تھا۔ لوگ اس میں شرکت کیلئے امنڈ پڑتے تھے۔

یہ ''سالانہ مشاعرہ'' مدرسہ اسلامیہ فتح پور ہی کیلئے مخصوص نہ تھا بلکہ اس قسم کے مشاعرے، اس وقت سارے اسلامیہ کالجوں اور مسلم اسکولوں میں منعقد ہوتے تھے، لیکن

Scanned with CamScanner

ان کی بج دھج آج کل کے مشاعروں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ خصوصاً ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان ان مشاعروں کی شان دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ اس موقع پر مدرسے کے نئے پُرانے سارے طالب علم جمع ہو جاتے تھے، اساتذہ، طلبہ، سرپرست اور رؤسا کے ساتھ ساتھ شہر کی پوری آبادی غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ ان مشاعروں میں حصّہ لیتی تھی، چونکہ اس زمانے میں ''تحریکِ پاکستان'' کے تحت اُردو ہندی کا جھگڑا شباب پر تھا اور ہندو طلبہ اردو مشاعرہ کے مقابلے میں ہندی کوی سمیلن برپا کرنے لگے تھے۔ اس لئے مشاعرے کیا ہوتے تھے، مسلم لیگ اور کانگریس کے پلیٹ فارم بن گئے تھے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس وقت مشاعروں کی کامیابی کو، ہندی کے مقابلے میں اردو کی فتح، کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی فتح اور بعض موقعوں پر کفر کے مقابلے میں ایمان کی فتح خیال کیا جاتا تھا۔

لیکن مسلمانوں کی معاشی حالت ہر جگہ بہت خراب تھی، اس لئے سالانہ مشاعرے کے اخراجات بڑی مشکل سے پورے ہوتے تھے، ہمارا شہر فتح پور صنعت وحرفت کی برکتوں سے دور پُرانے طرز کے زمیندار گھرانوں کا شہر تھا۔ اس ئے سالانہ مشاعرے کیلئے بہ مشکل چار چھ سو چندے کی صورت میں جمع ہو پاتے تھے۔ ایک طرف پیسوں کی کمی دوسری طرف مشاعرے کے بڑے شاعروں مثلاً جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، جگرؔ مراد آبادی، حفیظؔ جالندھری، ماہرؔ القادری، شکیلؔ بدایونی، احسان دانشؔ وغیرہ کا یہ عالم کے پیشگی پیسہ وصول کئے بغیر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ ذاتی تعلقات یارونے گانے سے کبھی کبھی رعائتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں دور دراز کے علاقوں سے ایک دو سے زائد بڑے شاعروں کو مشاعرے میں بلانا ممکن نہ ہوتا تھا۔ ہاں آس پاس کے شہروں خصوصاً کانپور اور الٰہ آباد کے شعراء فتح پور کے مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔

کانپور میں اس وقت جو شعراء موجود تھے، ان میں وحشیؔ کانپوری، گنگا دھر فرحتؔ، ثاقبؔ کانپوری، نشورؔ واحدی، وفاؔ کانپوری، کوثرؔ جائسی، شارقؔ ایرایانی، ماچسؔ لکھنوی، مسعود اختر جمالؔ، مذاقؔ کانپوری، دورؔ ہاشمی اور سیدہ اختر حیدر آبادی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، نوعمروں میں سرشارؔ صدیقی، پیامؔ فتح پوری اور اشتیاق حسین اظہرؔ شاعر کی حیثیت سے ہر محفل میں آگے آگے ہوتے تھے اور ان کی اُٹھان بتاتی تھی کہ وہ آئندہ کچھ نہ کچھ کر گزریں

Scanned with CamScanner

گے۔ الہٰ آباد میں وجدیؔ، شاطرؔ، مظفرؔ شاہ جہان پوری، فراقؔ گورکھپوری، حامد الہٰ آبادی، بسملؔ الہٰ آبادی اور وامقؔ جونپوری وغیرہ کے ہر طرف چرچے تھے۔ یہاں کے نوجوان شاعروں میں سحرؔ فتح پوری اور تیغؔ الہٰ آبادی اپنی طبعی اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بناء پر طلبہ کے حلقوں میں تیزی سے مقبول ہو رہے تھے۔ دونوں فراقؔ کے حلقہ اثر میں تھے۔ فراقؔ بھی دونوں کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے الہٰ آباد اور اس کے آس پاس کے مشاعروں میں جہاں فراقؔ صاحب جاتے وہاں یہ دونوں بھی اکثر ہوتے تھے۔

سحرؔ فتح پوری اب ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ ہو چکے ہیں اور شعر گوئی ترک کر کے اردو کے ممتاز محقق اور نقاد بن گئے ہیں، تیغؔ الہٰ آبادی توقع کے عین مطابق شاعر ہی بن کر اُبھرے، لیکن نام بدل کر یعنی تیغؔ الہٰ آبادی سے مصطفیٰ زیدی ہو گئے۔

تیغؔ الہٰ آبادی اور سحر فتح پوری سے میری بعض ملاقاتیں زندگی میں ہمیشہ یادگار رہیں گی اب سے ستاون اٹھاون سال پہلے یعنی ۱۹۴۸ء کے ایک سالانہ مشاعرے کی بات ہے، چندے کی رقم اتنی کم آئی کہ کانپور و الہٰ آباد کے سوا دور دراز کے شاعروں کو بُلانے کی ہمت نہ ہوئی، پھر بھی سالانہ مشاعرے کا بھرم رکھنے کیلئے دو بڑے آدمیوں نیازؔ فتح پوری اور فراقؔ گورکھپوری سے گزارش کی گئی کہ وہ مشاعرے میں شرکت کریں وجہ یہ تھی کہ نیازؔ صاحب اسی مدرسے کے تعلیم یافتہ تھے اور ہمیشہ اپنے خرچ سے آجاتے تھے جیسا کہ اُوپر ذکر آیا فراقؔ صاحب کی دو بہنیں فتح پور میں بیاہی تھیں اور انہیں بلانے کیلئے ان کے بہنوئی سے سفارشی خط لکھوایا گیا۔ بایں ہمہ انہوں نے اس بار مشاعرے میں شرکت کیلئے خاصی لمبی رقم طلب کی تھی، لیکن جب نیازؔ نے انہیں لکھا کہ:

''آپ کو فتح پور کے مشاعرے میں شرکت کرنی ہے میں بھی پہنچ رہا ہوں''۔

تو فراق صاحب بھی مشاعرے والی شام کو فتح پور پہنچ گئے۔ میں انہیں اسٹیشن لینے پہنچا تو مظفرؔ شاہ جہاں پوری کے علاوہ سحرؔ فتح پوری اور تیغؔ الہٰ آبادی بھی ان کے ساتھ تھے، مظفرؔ شاہ جہاں پوری کو میں نے باقاعدہ مدعو کیا تھا اور سحرؔ اور تیغؔ بالواسطہ دعوتوں کے ذریعے ہمارے مہمان تھے۔

مشاعرہ تقریباً دو بجے رات کو ختم ہوا کانپور اور الہٰ آباد کے بھی شعراء مظفرشاہ جہاں پوری خصوصاً فراقؔ صاحب نے اسی وقت رات کی گاڑی سے واپس جانا چاہا، میں نے ان

Scanned with CamScanner

کی خدمت میں سفر خرچ پیش کر دیا اس وقت کا سفر خرچ بھی کیا ہوتا تھا، کانپور کیلئے تھرڈ کلاس کیلئے ۱۴ آنے میں، ڈیوڑھے کیلئے ایک روپے ۴ آنے میں، سیکنڈ کیلئے دو روپے آٹھ آنے اور فرسٹ کلاس کیلئے پانچ روپیہ کا ٹکٹ ملتا تھا۔ الہٰ آباد کا کرایہ اس سے کچھ زیادہ تھا، لیکن ہماری ''بزم ادب'' مالی اعتبار سے اتنی کمزور تھی کہ سحؔر اور تیغؔ کے سفر خرچ کا انتظام نہ ہوا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے مجھ سے کرایہ طلب کیا، میں نے معذرت چاہی سحؔر صاحب ناراض تو بہت ہوئے لیکن خاموش رہے، تیغؔ مزاجاً تند و تیز تھے۔ اس زمانے میں، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، میرے اس رویئے سے سخت برہم ہوئے، کہنے لگے کرایہ آپ کو دینا پڑے گا، میں جس قدر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر مجھ سے الجھتے۔ آخر کار مجھے ان سے کہنا پڑا کہ جو لوگ مشاعرے کیلئے مدعو نہیں کئے گئے اور خود اپنے شوق سے آئے ہیں ان کے سفر خرچ کے ہم ذمہ دار نہیں۔ تیغؔ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ میں اپنی ضد پر قائم رہا۔ بات تو تو میں میں تک پہنچ گئی، تیغؔ نے آستین چڑھا لیں، میں بھی آگے بڑھا، ہاتھا پائی کی نوبت آنے ہی والی تھی کہ لوگ درمیان میں حائل ہو گئے۔ بات رفع دفع ہو گئی۔ میں سفر خرچ دینے پر آمادہ نہ ہوا، انہیں تو الہٰ آباد واپس جانا تھا، خفا ہو کر واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد سحؔر اور تیغؔ سے الہٰ آباد اور مجھ سے فتح پور چھوٹ گیا۔ سحؔر فتح پوری تو کچھ دنوں بعد ڈاکٹر ابو محمد سحؔر ہو گئے اور تیغؔ الہٰ آبادی مصطفیٰ زیدی بن گئے، ایک نے تنقید و تحقیق میں، دوسرے نے شاعری میں اپنا امتیازی نشان بنا لیا، دونوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے کو میرا بہت جی چاہتا تھا لیکن وہ بدسلوکی جو میں نے ان کے ساتھ روا رکھی تھی آڑے آ جاتی، مجھے اپنے کئے پر اتنی غیرت آئی کہ کبھی ان کے سامنے جانے یا ان کو مخاطب کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ رسالوں میں ان دونوں کے نام دیکھتا، ان کے مضامین اور ان کی نظمیں پڑھتا اور ایک عجیب و غریب قسم کے کرب روحانی میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کرب میں، میں ایک دو دن نہیں پورے بائیس سال مبتلا رہا۔

دسمبر ۱۹۶۸ء میں نگار کا سالنامہ ''اصنافِ شاعری'' کے نام سے شائع ہوا، اس میں، میں نے ڈاکٹر ابو محمد سحؔر کا ایک مضمون ان کی اجازت کے بغیر شامل کر لیا، ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر سے جب یہ نمبر گزرا تو خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ پورے بیس سال بعد انہوں نے مجھے خط کے ذریعے بھوپال سے یاد کر لیا۔ اس خط میں انہوں نے

Scanned with CamScanner

دوسری باتوں کے ساتھ نوجوانی کے پُرانے جھگڑے کا بھی ذکر اس طور پر کیا:

''ایک زمانہ ہوا میں فتح پور میں آپ سے ملا تھا، اسلامیہ اسکول کے سالانہ مشاعرے کے سلسلے میں ایک معمولی سی غلط فہمی آج تک یاد ہے۔ شاید آپ مجھے بھولے نہ ہوں گے۔ میں ۱۹۵۳ء میں حمیدیہ کالج (بھوپال) میں لکچرر ہو کر یہاں آیا تھا، کچھ عرصہ اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ آج کل پروفیسر و صدر شعبہ اردو ہوں''۔(۱)

ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کے اس خلاف توقع خط سے میں باغ باغ ہو گیا۔ بیس سال روحانی اذیت سے یک گونہ نجات مل گئی اور نجاتِ کامل پانے کی صورت نکل آئی، میں نے سرخوشی کے عالم میں سحرؔ کو ایک خاصا طویل اور بے تکلف خط لکھا، اب کچھ یاد نہیں کہ اس میں کیا کچھ لکھا تھا، لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ خط ماضی کی یادوں اور جذباتی باتوں سے پُر تھا اور اس کی پیشانی پر یہ شعر ضرور تھا:

اے خوشا وقت کے آئی و بصد ناز آئی　　　بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

سحرؔ صاحب بھی میرے خط سے جذباتی طور پر متاثر ہوئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک بہت تفصیلی خط لکھا جو پچیس سال پہلے کی پوری داستان ایک بار پھر اپنے لفظوں میں اس طرح دہرادی:

بھوپال

۷/ جون ۱۹۶۸ء

محبّ مکرم، تسلیم!

آپ نے جس پُر خلوص انداز میں مجھے مخاطب کیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ سے بے تکلف گفتگو کروں۔ اس سے پہلے، مجھ تک آپ کے صرف دو خط پہنچے تھے۔ پہلا خط تقریباً سات آٹھ برس ہوئے ملا تھا جس کا جواب میں نے انتقاماً نہیں دیا، دوسرا خط نیازؔ نمبر کے سلسلے میں کچھ رسمی نوعیت کا تھا، ایک تو فرمائش پر بہت کم کچھ لکھ پاتا ہوں، دوسرے نیازؔ صاحب کی شایانِ شان لکھنا میرے بس میں بھی نہ تھا۔ اس زمانے میں میری پوسٹنگ ریوا میں تھی، جس سے میں بہت پریشان تھا۔ مجبوراً خاموش رہا۔

مشاعرے کی چھوٹی سی افتاد کا میرے اُوپر جو اثر رہا وہ بالکل فطری تھا، لیکن مجھے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ اس واقعے نے آپ کو بھی تقریباً ویسی ہی خلش میں مبتلا رکھا:

Scanned with CamScanner

کی سیر جذب الفت گل چیں نے کل چمن میں   توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

یہ وہ زمانہ تھا جب میں دوستوں کے اصرار پر مشاعروں میں جانے لگا تھا، استاذی اسحاق صاحب کے ایما سے جب مجھے آپ نے مدعو کیا تو میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میں مدرسہ اسلامیہ سے کچھ قبول کروں گا۔ الہٰ آباد سے فتح پور کے مصارف کی کوئی حقیقت بھی نہ تھی لیکن بُرا ہو معاصرانہ رشک اور شاعرانہ حس کا کہ تیغ الہٰ آبادی اور مظفر شاہ جہاں پوری کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتے وقت مجھے دفعتاً یہ خیال ہوا کہ سفر خرچ تو مجھے بھی ملنا چاہئے میری حماقت کہ میں نے آپ سے تقاضا کر دیا، آپ انکار کرنے میں بالکل حق بجانب تھے لیکن میری غلطی کے نبھنے کی کوئی صورت نہ رہ گئی، نتیجہ صرف شرمندگی نہ رہا بلکہ اس کے ساتھ بے مہری یارانِ وطن کی شکایت بھی پیدا ہوئی، وقتی احساسات تو ختم ہو ہی جاتے ہیں، لیکن اپنی غلطی کا احساس ہمیشہ دیرپا ہوتا ہے، لیکن یہ میری اپنی چیز ہے، آپ سے کوئی شکایت یا رنجش نہیں، اگر ایسا ہوتا تو میں مراسلت کا آغاز کیوں کرتا"۔(۲)

جس زمانے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ خط مجھے ملا، اس کے کچھ دنوں بعد کی بات ہے، مصطفیٰ زیدی لاہور سیکریٹریٹ میں کسی محکمے کے سیکریٹری تھے، میری لڑکی ان دنوں فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتی تھی اور میں اسے لاہور سے کراچی لانے کی فکر میں تھا، چنانچہ اس فکر میں لاہور گیا اور دو تین ہفتے وہاں ٹھہرا، سجاد باقر رضوی سے ذکر کیا، کہنے لگے مصطفیٰ زیدی کے پاس چلتے ہیں؟ میں نے اچھا تو کہا لیکن ان کے ساتھ مصطفیٰ زیدی تک جانے کی ہمت نہ ہوئی، صرف اس خوف سے کہ خدا جانے میرے ساتھ ان کا سلوک کیا ہو اور دوسروں کے سامنے مجھے خفت اٹھانی پڑے، گویا مجھے ان سے ملنے میں اتنی جھجک نہ تھی جتنی کسی کے ساتھ ان کے سامنے جانے میں۔ اس لئے میں، سجاد باقر رضوی کے ساتھ تو نہ گیا لیکن سیکریٹریٹ کی طرف جب بھی جاتا، ایک طرح کی جذبۂ ندامت کے باوجود مصطفیٰ زیدی سے ملنے کا خیال پیدا ہوتا۔ ان کے دفتر کے قریب تک جاتا اور پھر خدا جانے کیا سوچ کر واپس آ جاتا۔ ایک دن ہمت کر کے اپنے نام کا پیغام بھجوا دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد بلوا لیا لیکن پہچان نہیں سکے۔ سلام علیکم کے بعد بولے۔

"آپ کا تعلق کس فتح پور سے ہے"؟

"فتح پور ہسوہ سے"۔

---

۱ خط بنام راقم الحروف مرقومہ ۳ مئی ۱۹۶۸ء

۲ خط بنام راقم الحروف مرقومہ ۷ جون ۱۹۶۸ء

''وہاں کے مشاعروں میں تو میں بھی ایک آدھ بار گیا ہوں''۔

مشاعرے کا ذکر آنا تھا کہ ایک بار پھر عرقِ انفعال میں ڈوب گیا، سنبھل کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے خود ہی مشاعرہ سیکریٹری سے اپنی جنگ کی داستان چھیڑ دی۔ اس ڈر سے کہ کہیں سیکریٹری کے پردے میں مجھے گالیاں نہ پڑنے لگیں، ان کی بات کاٹتے ہوئے میں نے فوراً کہا، ''فتح پور کے مشاعرے کے جس سیکریٹری کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ یہی بندہ ناچیز ہے''۔ یہ سُن کر اُچھل پڑے، بغل گیر ہوئے، بہت دیر تک ہنستے رہے چٹخارے لیکر پُرانی باتیں سناتے رہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا ذکر آیا تو ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ پھر مجھ سے میرے حالات پوچھے اور لاہور آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو اسی وقت محکمہ صحت کے متعلقہ افسر کو فون ملایا، لیکن چونکہ وہ ان دنوں طویل رخصت پر تھے، اس لئے بات نہ ہو سکی، پھر بھی ان کے کرنے کا جو کام تھا، وہ انہوں نے کر دیا تھا، اس ملاقات کا یہ حاصل کیا کم تھا کہ میں گزشتہ پچیس سال سے جس کربِ روحانی میں مبتلا تھا، اس سے نجات مل گئی تھی۔

اب، جب کبھی، ان ساری باتوں کو یاد کرتا ہوں اور پُرانے قصوں کو ذہن میں اُبھارتا ہوں تو تیغ الٰہ آبادی اور مصطفیٰ زیدی دونوں ایک عظیم انسان کی حیثیت سے میرے سامنے آجاتے ہیں اور میں ان کی روح کے سامنے خود کو شرمندہ پاتا ہوں۔

۱۹۴۸ء میں فتح پور کے مشاعرے سے قطع نظر کہ اس کا ذکر تو اپنی جگہ ضمناً اور ضرورتاً کرنا پڑا، کراچی میں مارچ ۱۹۵۲ء کے مشاعرے کے سلسلے میں جو خطوط فراق گورکھپوری کو لکھے گئے اور جن کے جوابات آئے، ان کے حوالے سے کچھ اور باتیں قارئین کیلئے دلچسپ ہوں گی ایک آدھ بات سُن لیجئے۔

میں نے مشاعرے کے سلسلے میں فراق صاحب کو جنوری فروری ۱۹۵۲ء کے مہینوں میں الٰہ آباد کے پتے پر متعدد خطوط لکھے لیکن فراق صاحب نے میری توقع کے خلاف جوابات نہیں دیئے جب وہ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ۶ مارچ کو کراچی پہنچ گئے تو میں نے نہایت ادب کے ساتھ ان سے خطوں کے جواب نہ دینے کا سبب پوچھا کہنے لگے۔

''میں الٰہ آباد میں نہ تھا۔ کانگریس پارٹی کے خلاف مرکزی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہا تھا'' اور اپنے وطن گورکھپور میں تھا، اسلئے آپ کے خطوط کے جوابات نہ دے سکا۔

Scanned with CamScanner

میں نے سوال کیا ''انتخاب کا کیا حشر ہوا''؟

کہنے لگے۔ میرے معاونین مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے اور جب ایک بڑے لیڈر نے جلسے سے میرا تعارف اس طور پر کرایا کہ

''اب فراق صاحب اپنے ٹوٹے پھوٹے شبدوں میں بھاشن دیں گے''

تو مجھے اسی وقت اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا اور وہی ہوا۔

اُوپر دیا ہوا فقرہ جو ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں گھرا ہوا ہے درحقیقت اس پاکیزہ اُردو فقرے کا بگاڑ ہے جسے کوئی مہمان مقرر عاجزی و انکسار کے انداز میں یوں ادا کرتا ہے کہ

''اب میں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ عرض کروں گا''۔

فراق گورکھپوری سے میری آخری ملاقات الٰہ آباد میں ان کے گھر پر ہوئی، غالباً ۸۰-۱۹۷۹ء کی بات ہے، ''میں ایوان غالب کی دعوت پر دہلی میں تھا، آبائی وطن کی کشش، پہلے مجھے فتح پور لے گئی، پھر فتح پور سے الٰہ آباد جانا ضروری ہو گیا۔ الٰہ آباد میں، میری کشش کا سبب، میری حقیقی بہن، برادر نسبتی اور بھانجے بھانجیوں کے علاوہ بیسویں صدی کے عظیم غزل گو شاعر، فراق گورکھپوری کی ذات بھی تھی، چنانچہ الٰہ آباد پہنچ کر، دوسرے ہی دن صبح سوا آٹھ بجے بنک روڈ کا رُخ کیا، یہ فراق گورکھپوری کا مسکن تھا ہر چند کہ فراق صاحب سے میری نیازمندی بہت پرانی تھی، لیکن آج میں اُن سے تقریباً ۲۸ سال بعد مل رہا تھا اس لئے وہ مجھے پہچان نہ سکے، اوّل تو ان کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ الٰہ آباد میں کئی سال سے صاحبِ فراش تھے، گٹھیا کے موذی مرض نے آدھے دھڑ کو بے کار کر دیا تھا۔ لیٹے لیٹے ہی زندگی بسر ہو رہی تھی، البتہ چہرے بشرے سے تندرست معلوم ہوتے تھے اور ان کی چوڑی پیشانی پر، تخلیقی فنکار کے جلال و جمال کی چاندنی چھٹکی نظر آتی تھی۔ حافظے اور ذہن پر قابو نہیں رہا تھا، یعنی کبھی تو نسیان کے دباؤ سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے تھے اور کبھی ہر طرح ہوش و حواس میں ہوتے تھے۔

میں پہنچا تو باہر کے ورانڈے میں پیروں پر کمبل ڈالے اکیلے لیٹے ہوئے سنترے کھا رہے تھے، قریب ہی ایسی تپائیاں اور لکڑیاں رکھی تھیں جن کا سہارا لے کر وہ سیدھے بیٹھ سکیں یا اٹھ

Scanned with CamScanner

سکیں مجھے صحن میں داخل ہوتے دیکھ کر، چونکے اور مجھے گھورتے ہوئے، آواز لگائی، ارے بھائی کوئی ہے! ان کی آواز پر، ایک لڑکا اندر سے باہر آتا نظر آیا اور میں نے اسی اثناء میں کہا ''فراق صاحب آداب عرض'' کڑک کر بولے آداب عرض میں نے پوچھا ''فراق صاحب آپ نے پہچانا'' بولے ''نہیں'' میں نے کہا میں پاکستان سے آیا ہوں، کہنے لگے، ''بھائی پاکستان میں دس بارہ دفعہ جاچکا ہوں، ایک بار فلاں سن میں، دوسری بار فلاں سن میں اور ابھی پچھلے سال بھی ہو کر آیا ہوں۔'' مجھے بے ساختہ ہنسی آئی، لیکن قابو پالیا، میرے بھانجے عین الحق ایڈووکیٹ جنہوں نے الہٰ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے اور شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، اپنے دوستوں سمیت میرے ساتھ تھے، انہوں نے مجھے فراق صاحب کی ذہنی کیفیت سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا، میں سمجھ گیا کہ اس وقت، یہ اپنے قابو میں نہیں ہیں، بیٹھ گیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، تھوڑی دیر میں فراق صاحب بالکل نارمل ہو گئے۔ ساری باتیں یاد آ گئیں، ۱۹۵۲ء میں کراچی کے سفر، قیام اور احباب، سب کا ذکر کرتے رہے نیاز صاحب کا تذکرہ ہوا تو بڑے چاؤ سے سنتے اور ان کے خاندان کا حال پوچھتے رہے، جوش ملیح آبادی اور مجنوں گورکھپوری کے بارے میں خصوصیت سے سوال کیئے۔ محمد حسن عسکری، مجتبیٰ حسین اور ممتاز حسین سے متعلق بھی اُنہوں نے بہت کچھ پوچھا، ان سب کی تصنیفی و تخلیقی زندگی اور مشاغل و معمولات کی تفصیل، میں نے سنائی تو خوش ہوئے، محمد حسن عسکری کی ناگاہ وفات کا ذکر اُنہوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کیا، بات کا رُخ موڑ کر، میں نے اشعار کی فرمائش کی اُنہوں نے مجھے کچھ متفرق اشعار اور تازہ غزلیں سنائیں، افسوس کہ اس وقت نہ میرے پاس قلم تھا نہ ڈائری، وہ خود اس لائق تو مدت سے نہیں تھے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکیں، تقریباً دو گھنٹے اُن کے پاس بیٹھا، اُن کی باتوں سے لطف اٹھایا، اجازت چاہی اور اُنہوں نے بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

Scanned with CamScanner

فراق گورکھپوری کے مختصر سوانحی کوائف

نام	:	رگھوپتی سہائے
تخلص	:	فراق
تاریخ وسال پیدائش	:	۲۸/ اگست ۱۸۹۶ء
جائے پیدائش	:	لکشمی بھون، گورکھپور
انتقال	:	۳ مارچ ۱۹۸۲ء
جائے وفات	:	دہلی
والد	:	منشی گورکھ پرشاد عبرت
والد کی وفات	:	۱۸/ جون ۱۹۱۸ء
بھائی	:	۱۔ گنپت سہائے
		۲۔ دھنپت سہائے
		۳۔ شری پت سہائے
		۴۔ یدوپت سہائے
بہن	:	۱۔ سورج
		۲۔ چندا
		۳۔ تارا

غیر رسمی تعلیم:

اردو، فارسی

انگریزی تعلیم:

گورنمنٹ جوبلی اسکول، گورکھپور

ماڈل اسکول، گورکھپور

Scanned with CamScanner

مشن اسکول، گورکھپور

میٹرک	:	۱۹۱۳ء گورکھپور
ایف اے	:	۱۹۱۵ء الہٰ آباد
بی اے	:	۱۹۱۸ء الہٰ آباد
ایم اے انگریزی	:	۱۹۳۰ء آگرہ یونیورسٹی

شادی	:	۲۹ جون ۱۹۱۴ء
بیوی	:	کشوری دیوی

مشغلۂ معاش و درس و تدریس

کرسچن کالج میں اُستاد مقرر ہوئے	۱۹۲۷ء
الہٰ آباد یونیورسٹی میں اُستاد مقرر ہوئے	۱۹۳۲ء
ملازمت سے سبکدوشی	۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء
یو جی سی نیشنل پروفیسر	۱۹۶۶ء تا ۱۹۲۸ء
شاعری کا آغاز	۱۹۱۶ء
تلمذ	امیرؔ مینائی، وسیم خیرآبادی

اعزازات وانعامات

ساہتیہ اکاڈمی انعام	۱۹۶۱ء
سرکاری اعزاز، پدم بھوش	۱۹۶۷ء (حکومت ہند)
بھارتیہ گیان پیٹھ ادبی انعام	۱۹۶۹ء

Scanned with CamScanner

فراق کے شعری مجموعے، جو میری نظر سے گزرے

''روپ''

(سنگھار رس کی رُباعیاں) فراق گورکھپوری کی رُباعیوں کا پہلا مجموعہ، سنگم پبلشنگ ہاؤس الہٰ آباد سے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں، عام کتابی سائز سے بھی چھوٹے سائز پر شائع ہوا۔ اس کا انتساب اس طور پر ہے

شاعرِ اعظم جوش ملیح آبادی کے نام

اور اس پر ۲۹ دسمبر ۱۹۴۶ء تاریخ ثبت ہے۔ بعدازاں بہ عنوان ''چند باتیں'' مختصر سا دیباچہ ہے اور دیباچے کے آخر میں ۲۵/ جنوری ۱۹۴۷ء کی تاریخ ہے۔ کتاب میں کل ۱۹۰ صفحات اور ۳۴۷ رُباعیاں ہیں۔ کتاب دو ہزار کی تعداد میں چھپی ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں ہے میں اسے اپنے ساتھ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے وقت لایا تھا۔

''شبنمستان''

۲۰۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۵ء میں وشو دوالہ پریس الہٰ آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کی غزلیں شامل ہیں، ہر غزل کے اوپر تخلیق سال درج ہے۔ قیمت چھ روپے پچاس پیسے ہے۔ صرف دو صفحے کا دیباچہ ہے، فہرست میں ہر غزل کا پہلا مصرعہ درج کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز غزل کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا کوئی زماں مکاں نہ تھا
دیر تھی اِک نگاہ کی پھر یہ جہاں جہاں نہ تھا

آخری غزل کا مطلع ہے۔

اپنے غم کا مجھے کہاں غم ہے
اے کہ تیری خوشی مقدم ہے

Scanned with CamScanner

رمز وکنایات

۳۰۴ صفحات کی یہ کتاب بھی بہت چھوٹی تقطع میں ''روپ'' کے سائز پر اور پہلی بار ہزار چھپی ہے اس میں بھی صرف غزلیں ہیں اور یہ تعداد میں ۸۴ ہیں۔ سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے ۱۹۴۷ء میں چھپی ہے۔ کتاب کے آخر صفحہ ۳۰۴ کے آخر میں درج ذیل رُباعی شامل ہے۔

تو ہر لحظہ کچھ اور آتا ہے نظر
ہر جلوہ ہے پچھلے جلوے سے نازک تر
ہر خطِ بدن میں جذب نغمے جیسے
سوتی ہیں حقیقتیں لب شاعر پر

کتاب کے بیچ بیچ جہاں کسی صفحے کا کوئی حصّہ خالی جارہا تھا اسے غزل کے متفرق اشعار کے ذریعے پُر کر دیا گیا ہے۔

''مشعل''

یہ فراق گورکھپوری کے کلام کا انتخاب ہے اور خود اُنہی کے قلم سے ہے۔ مکتبہ نژاد نو لکھنؤ سے ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ ''حاشیہ'' کے عنوان سے شروع میں تیرہ صفحے کا دیباچہ ہے بعد ازاں، غزلیات، رُباعیات اور نظموں کا انتخاب ہے۔ آخر میں ''آبگینے'' کے زیرِ عنوان متفرق اشعار ہیں کتاب میں کل ۲۰۸ صفحے ہیں۔ آخری صفحے کے آخر میں یہ شعر درج ہے

تو ایک تھا، مرے اشعار بس ہزار ہو
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

''روح کائنات''

فراق کی نظموں کا مجموعہ ہے اور فراق نے اسی کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

Scanned with CamScanner

''اس مجموعے میں ۱۹۲۶ء سے لے کر اب تک کی کہی ہوئی میری تمام نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں میری غزل گوئی کے وقفوں میں کہی گئی ہیں اور ۱۹۳۱ء تک کی نظمیں اُس زمانے کی یادگار ہیں جب اُردو اَدب کی تاریخ میں وہ نئی تحریک پیدا ہوئی تھی جس کا تعلق ترقی پسند اَدب سے ہے۔ ۱۹۳۱ء سے چار برس تک میں نے صرف غزلیں کہیں۔ پھر ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند اَدب کی تحریک شروع ہوئی اور اس وقت ۱۹۴۳ء تک کی نظمیں سیاسی، سماجی اور انقلابی تاثرات ورجحانات کی حامل ہیں''۔

''روح کائنات'' پوری کی پوری فراق کی نظموں پر مشتمل ہے۔ دیباچہ بہت اہم ہے کہ اس میں فراق نے اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں بہت سے گوشے خود واضح کر دیئے نیز ہم عصر شاعری اور اس کے موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھ دیا ہے۔

کتاب میں کل ۳۳۷ صفحات ہیں۔ یہ مکتبہ اُردو اَدب لاہور سے چھپی ہے۔ طباعت کا سال درج نہیں ہے، فراق نے اپنے دیباچے کے آخر میں دستخط کے ساتھ ۱۹۴۵ء کا سن لکھا ہے۔ اسی کو تاریخ طباعت و اشاعت سمجھنا چاہیے۔ قیمت صرف تین روپے ہے۔

''غزل''

یہ فراق گورکھپوری کی غزلوں کا انتخاب ہے اور نیا ادارہ لاہور سے پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ انتخاب، فراق کا نہیں بلکہ ناصر کاظمی کا ہے اور اس پر نظر ثانی محمد حسن عسکری نے کی ہے۔ یہ انتخاب ایک سو اسی (۱۸۰) صفحات پر مشتمل ہے اور دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھپا ہے انتخابِ غزلیات سے پہلے فراق گورکھپوری کا پیش لفظ ہے فراق نے پانچ صفحے کے اس پیش لفظ میں اُردو غزل کے معنوی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ کے آخر میں ۹/ جون ۱۹۵۸ء کی تاریخ دی ہوئی ہے۔ اس سے سراغ لگا کہ یہ دیباچہ فراق کے کسی پُرانے مضمون سے ماخوذ ہے۔

Scanned with CamScanner

''غزلستان''

یہ بھی غزلوں کا انتخاب ہے۔کل ایک سوستر (۱۷۰) صفحات ہیں۔شروع میں حرفِ اوّلین کے نام سے فراق کا دیباچہ ہے۔ساہتیہ کلا بھون۔۱۸۔اے مہاتما گاندھی مارگ الٰہ آباد نمبرا سے شائع ہوا ہے۔پہلی اشاعت کا سال ۱۹۶۵ء ہے قیمت ساڑھے چھ روپے ہے۔

اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی فہرست مضمون میں ہر غزل کے ساتھ اس کی تخلیق کا سال بھی درج ہے۔کل ایک سو چودہ غزلیں ہیں۔

پہلی غزل کا مطلع ہے۔

نگاہِ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہل محبت کو آئے ہیں کیا کیا

آخری غزل کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

نگاہ بھی نہ اُٹھی اور عشق رسوا ہے
فراقؔ اتنی بھی حیرت نہ کر یہ دنیا ہے

''شعلۂ ساز''

فراق کا یہ شعری مجموعہ مکتبہ اُردو لاہور سے ۱۹۴۵ء میں چھپا ہے اور منتخب ہے۔کل ۲۴۸ صفحات ہیں منتخب کلام سے پہلے یوسف ظفر کا بسیط مقدمہ ہے۔جس میں اُنہوں نے فراق کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔یوسف ظفر کے مقدمے کے بعد خود فراق نے اس مجموعے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے مجموعے کا آغاز مندرجہ ذیل رُباعی سے ہوتا ہے۔

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صدِ جام و سُبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

Scanned with CamScanner

''ہزار داستان''

یہ بھی فراق کا مجموعہ کلام ہے اور شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ نئی دہلی سے چھپا ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۷۴ صفحات ہیں۔ پہلا ایڈیشن دو ہزار کی تعداد میں ۱۹۶۴ء میں چھپا تھا۔ اس پر شمیم حنفی کا پیش لفظ ہے بہت مختصر صرف دو صفحے کا۔ اس مجموعے کا نام ''ہزار داستان'' یوں ہے کہ اس میں فراق کے پورے ایک ہزار منتخب اشعار شامل ہیں۔

''گل نغمہ''

فراق کا یہ مجموعہ کلام ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور پہلی ۱۹۵۹ء میں اسرار کریمی پریس الہٰ آباد سے شائع ہوا ہے۔ سیکریٹری نشر و اشاعت کے تحت ادارۂ رئیس اُردو روڈ الہٰ آباد کا نام درج ہے۔ آغازِ کلام سے پہلے مفتی فخر الاسلام ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہٰ آباد کا دیباچہ ہے۔ عنوان ہے۔ ابتدائیہ۔ بعد ازاں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا مفصل مضمون ہے جس میں فراق کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی نوعیت کا مفصل مضمون ایک اور ہے جس کے مصنف پروفیسر محمد حسن عسکری ہیں۔ کتاب کی قیمت صرف چھے روپے ہے۔

Scanned with CamScanner

میری پسند

غزلیات

منظومات

رُباعیات

متفرقات

Scanned with CamScanner

غزلیات

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کہ محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اُٹھاتے نہیں دیوانہ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

ہم اسے مُنہ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پُو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اُن کی رہگذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پر آنکھ بھر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بَلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی ہے
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہیں زمان و مکاں میں ہے نام کو بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

زرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شبِ فراقؔ اُٹھے دل میں اور بھی کئی درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

Scanned with CamScanner

دیکھ محبت کا یہ عالم ساز بھی کم کم، سوز بھی کم کم
یہ شیرازۂ دل کا ہے عالم یک جا یک جا، برہم برہم
حسن گلستاں شعلہ و شبنم سوزاں سوزاں، پُرنم پُرنم
یاد ہے ان آنکھوں کا عالم مستی کم کم، وحشت کم کم
عالم عالم عشق بھی تنہا تنہا حسن بھی عالم عالم
یہ کیا کم ہے عشق کا حاصل کچھ مجھ کو غم، کچھ تجھ کو غم
آتی بہاریں، جاتی بہاریں دونوں کا حاصل دیدۂ پرنم
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے جھوٹے نہیں تم، جھوٹے نہیں ہم
ہم نے بھی آج فراقؔ کو دیکھا
سوز مکمل، درد مجسم

رس میں ڈوبا ہوا لہراتا بدن کیا کہنا کروٹیں لیتی ہوئی صبحِ چمن کیا کہنا
مد بھری آنکھوں کی السانی نظر پچھلی رات نیند میں ڈوبی ہوئی چندر کرن کیا کہنا
باغ جست پہ گھٹا جیسے برس کر کھل جائے سوندھی سوندھی تری خوشبوئے بدن کیا کہنا
روپ سنگیت نے دھارا ہے بدن کا یہ رچاؤ تجھ پہ لہلوٹ ہے بے ساختہ پن کیا کہنا
دل کے آئینے میں اس طرح اترتی ہے نگاہ جیسے پانی میں لچک جائے کرن کیا کہنا
یہ نگاہوں کی کھنک، تیغ ادا کی جھنکار حسن سر تا بقدم بولتا رن کیا کہنا
قد رعنا کی یہ چمکار یہ آیا ہوا پیار عشق کا حسن نے بدلا ہے برن کیا کہنا

Scanned with CamScanner

فسردہ پا کے محبت کو مسکرائے جا — اب آ گیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا
اس اضطراب میں راز فروغ پنہاں ہے — طلوع صبح کے مانند تھرتھرائے جا
جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آب حیات — ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے — بگڑ بگڑ کے یونہی زندگی بنائے جا
کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق پر — برت خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا
خلوص عشق کو کر ماورائے غفلت و ہوش — کسی کی یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا
شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار — ابھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا
نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور — مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

تو تھا یا کوئی تجھ سا تھا — میری راہ میں کون کھڑا تھا
کون بتائے عشق میں تیرے — دکھ کتنا تھا سکھ کتنا تھا
کیا دھرا سب سامنے آیا — میں پہلے سے دیکھ رہا تھا
وادی وادی، جنگل جنگل — جیسے کوئی چلا آتا تھا
میں بھی سچا، تم بھی سچے — عشق میں سچ ہی کا رونا تھا
روتے روتے فراق ہجر میں
کوئی اکثر ہنس پڑتا تھا

Scanned with CamScanner

یہ آج اشک سے آنکھوں میں کیوں آئے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے

کسی کی شوخیٔ پنہاں میں یہ نکھار نہ تھا
فسردہ دل بھی ہیں کچھ آج رنگ لائے ہوئے

اب اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں ان کی
دل آشنا ہوئے، اپنے ہوئے، پرائے ہوئے

بہت لطیف اشارے ہیں دورِ حاضر کے
کچھ آج اہلِ سکوں بھی ہیں تلملائے ہوئے

نثار کرنے کو تجھ پر کہاں سے لائیں خوشی
یہی ہیں کچھ غمِ پنہاں بچے بچائے ہوئے

یہ شاد کام محبت، یہ راز دانِ نشاط
یہ لوگ اپنے لہو میں ہیں کیوں نہائے ہوئے

جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

فراقؔ تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

موت اک گیت رات گاتی تھی
زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

وہ ترا غم ہو یا غمِ آفاق
شمع سی دل میں جھلملاتی تھی

روتے جاتے تھے تیرے ہجر نصیب
رات فرقت کی ڈھلتی جاتی تھی

غم کی وہ داستانِ نیم شبی
آسمانوں کو نیند آتی تھی

زندگی زندگی کو وقت سفر
کارواں کارواں چھپاتی تھی

ذکر تھا رنگ و بو کا اور دل میں
تیری تصویر اتری جاتی تھی

کروٹیں لے افق پہ جیسے کوئی
صبح اس طرح رسمساتی تھی

Scanned with CamScanner

جولا نگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

کب دیکھیے دلوں کو ملے اذنِ یاس بھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

تاریخِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات
مجبوراتنی عشق کی بے چارگی نہیں

تکلیفِ ہجر کو نہ بتا عیش جاوداں
غم کی شبِ دراز بھی اتنی بڑی نہیں

شامیں کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراقؔ
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

حیات درد ہوئی جا رہی ہے کیا ہوگا
اب اس نظر کی دعائیں بھی مستجاب نہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

کچل کے سر جو اٹھائیں حریف فکر نہ کر
کب اڑتی خاک سواروں کی ہمرکاب نہیں

Scanned with CamScanner

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا ‏ — وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں ‏ — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نُور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا ‏ — آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات ‏ — ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم، جو بھی کر احسان و کرم ‏ — تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گمان ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جُدا ہوتا ہے ‏ — آستینوں میں لئے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی ‏ — پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حُسن ترا ‏ — دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا یہ رات ‏ — یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

ہم اہل انتظار کے آہٹ پہ کان تھے ‏ — ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چلی تھی رات

ہر سعی دہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے ‏ — تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

ہم اہل دل ہیں چشم کرم سے بھی بے نیاز ‏ — سُن اے نگاہ ناز اب اگر آ پڑی ہے بات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی رُوح بھی ‏ — ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں ‏ — ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں ‏ — چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہمات

مجھ کو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراقؔ
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

Scanned with CamScanner

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلف، پریشاں، داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

عشق بے پروا بھی اب کچھ نا شکیبا ہو چلا
شوخیٔ حسنِ کرشمہ ساز کی باتیں کرو

عشق کی کایا پلٹ دی جس کی فرقت نے فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اُڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں

جنوں سے بھول ہوئی دل پہ چوٹ کھانے میں
فراقؔ دیر ابھی تھی بہار آنے میں

اب ان کو مہرِ قیامت کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
ہوئے جو کھپ کسی کی حیاء اٹھانے میں

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

Scanned with CamScanner

ستاروں کی تقدیر یہیں جاگ رہی ہے
سوتے ہیں نہ افلاک زمیں جاگ رہی ہے

کروٹ سی شبِ ماہ میں لیتی ہے یہ گنگا
یا حسن کی بل کھائی جبیں جاگ رہی ہے

ہیں خواب میں عشاق مگر یاد کسی کی
یا دل میں ہے یا دل کے قریں جاگ رہی ہے

اِک عالمِ نیرنگ ہے دنیائے محبت
سوتی ہے کہیں اور کہیں جاگ رہی ہے

یہ رات اندھیری ہے مگر اے غمِ فردا
سینوں میں ابھی شمعِ یقیں جاگ رہی ہے

سوتی ہے جہاں عشق کی تقدیر ازل سے
وہ نرگسِ بیمار وہیں جاگ رہی ہے

یہ نکھری ہوئی رات فراقؔ آنکھ تو کھولو
سوتا ہوا سنسار، زمیں جاگ رہی ہے

دیارِ غیر میں سوزِ وطن کی آنچ نہ پوچھ
خزاں میں صبحِ بہارِ چمن کی آنچ نہ پوچھ

فضا ہے دہکی ہوئی رقص میں ہے شعلۂ گل
جہاں وہ شوخ ہے اس انجمن کی آنچ نہ پوچھ

قبا میں جسم ہے یا شعلہ زیرِ پردۂ ساز
بدن سے لپٹے ہوئے پیرہن کی آنچ نہ پوچھ

تمام بادِ بہاری، تمام خندۂ گل
شمیم زلف کی ٹھنڈک، بدن کی آنچ نہ پوچھ

حجاب میں بھی اسے دیکھنا قیامت ہے
نقاب میں بھی رخِ شعلہ زن کی آنچ نہ پوچھ

لپک رہے ہیں وہ شعلے کے ہونٹ جلتے ہیں
نہ پوچھ موجِ شرابِ کہن کی آنچ نہ پوچھ

دیئے ہی جاتی ہے ترغیب جرمِ آدم کو
غضب ہے سوزِ دلِ اہرمن کی آنچ نہ پوچھ

فراقؔ آئینہ در آئینہ ہے حسنِ نگار
صباحتِ چمن اندر چمن کی آنچ نہ پوچھ

Scanned with CamScanner

کوئی رگِ دل افسردہ آج پھر اکساؤ
پھر آج غم کے شبستاں میں اک چراغ جلاؤ

یہاں خود اپنا فریبِ نگاہ کیا کم ہے
یہ کیا ضرور ہے جو اس کی نظر کے دھوکے کھاؤ

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں
گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ

کرد نہ گریۂ معصوم عشق کو رسوا
چمکتے جھوٹ سے پانی میں تو نہ آگ لگاؤ

بجا یہ ترکِ محبت، بجا یہ عزم محال
کسی کو خیر نہ اب چاہنا قسم تو نہ کھاؤ

جہان میں ہے بڑی چیز خود فریبی عشق
کسی کا عہد وفا جھوٹ ہی ہو مان بھی جاؤ

فراقؔ اس کی محبت سے باز کیوں آئیں
اب اس میں ایک جہاں سے بگاڑ ہو کہ بناؤ

قفس سے چھٹ کہ وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

کھلا ہے ہوش میں آ کر فریبِ بادہ کشی
سیاہ کاروں کے دامن کو داغ بھی نہ ملا

حریفِ خضر تھا ہر مست بادۂ عرفاں
دلیلِ راہ مگر اک چراغ بھی نہ ملا

نگاہِ مست وہاں لے گئی محبت کو
جہاں کے ہوش و جنوں کا سراغ بھی نہ ملا

یہ جوشِ مے، یہ بھرا میکدہ، یہ ابر، یہ باد
زہے نصیب کہ خالی ایاغ بھی نہ ملا

فراقؔ معجزۂ سوز و ساز کیا کرتے
ابھر سکے جو کسی سے وہ داغ بھی نہ ملا

Scanned with CamScanner

دل کشتۂ فریبِ تمنا ہے آج بھی
اس کی نگاہ اک نئی دنیا ہے آج بھی

افسردگیٔ عشق کو مدت ہوئی مگر
شعلہ سا کچھ دلوں سے لپکتا ہے آج بھی

گو بے حسیٔ دل کو زمانہ گزر گیا
رہ رہ کے خارِ عشق کھٹکتا ہے آج بھی

نو میدیوں کی مدتِ دیرینہ پر نہ جا
اے چشمِ یار تیرا بھروسا ہے آج بھی

ہر دور ایک منزلِ معراجِ عشق ہے
درد اس نگاہِ ناز سے اٹھتا ہے آج بھی

اب بھی اچھل رہا ہے لہو سا فضا میں کچھ
دار و رسن یہ عشق کا قبھا ہے آج بھی

اس پرسشِ کرم پر تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

سچ جھوٹ کی خبر تو کسے لیکن اے فراقؔ
کوئی بیانِ درد سُناتا ہے آج بھی

کسی سے چھوٹ کے شاد اور کسی سے مل کے غمیں
فراقؔ تیری محبت کا کوئی ٹھیک نہیں

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

جو بھولتیں بھی نہیں، یاد بھی نہیں آتیں
تیری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

لبِ نگار ہے یا نغمۂ بہار کی لَو
سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطربِ رنگیں

شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب
تمہیں بھی بھول چکا ہے مجھے بھی یاد نہیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

ہنر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم ہیں

Scanned with CamScanner

زندانِ ہند

اب اک زمانے سے بے دست و پا ہیں تدبیریں
کہاں ہیں سوئی ہوئی قیدیوں کی تقدیریں

دماغ و دل پہ یہاں بیڑیاں ہیں مذہب کی
گلے سے لپٹی ہوئی ماضیوں کی زنجیریں

کلائیوں میں رسوم کہن کی ہتھکڑیاں
خمیدہ پشت پہ صدیوں کی سخت تعزیریں

تمام بادِ ہوائی، یہ شورِ بے ہنگام
یہ دھوم دھام، یہ بے کار اور تقریریں

نہیں جو نانِ شبینہ تو بحثِ کلچر ہے
زمیں پہ بے سرو ساماں، خلا میں تعمیریں

کڑک رہی ہے کمانِ قضائے ناشدنی
چمک رہی ہیں کھلی گردنوں پہ شمشیریں

دھواں ہیں وقت کی نبضیں، یہ دورِ بحرانی
فراز عرش کی ہلتی نہیں ہیں زنجیریں

ہر اک کو شامِ غریباں کی یاد آنے لگی
اب اتنی ماند ہیں صبح وطن کی تنویریں

یہاں بجائے عمل صرف ذکرِ گیتا ہے
بجائے علم فقط جہل کی ہیں تفسیریں

جو چلتی پھرتی نظر آرہی ہیں چار طرف
وہ زندگی کی ہیں یا موت کی ہیں تصویریں

ازل ہی سے یہ رہی کاتبوں کی تختۂ مشق
جبینِ ہند کی گنجلک سے پُر ہیں تحریریں

مدبّرانِ وطن سے یہ کوئی کہہ دیتا
ہمیں مٹا کے نہ رکھ دیں تمہاری تدبیریں

بجا یہ قول کہ دیر آید و درست آید
مزہ ابد کا چکھانے لگی ہیں تاخیریں

ہوئی ہیں آئینہ مدت کے بعد زار و دریغ
سفید خونِ حکومت میں پھوٹی تقدیریں

بلا سے دادِ سعادت وری تو دیتے ہیں
بھگت رہے ہیں ہم اجداد کی جو تقصیریں

حیاتِ موت نما، فاقہ، سسکیاں، آنسو
غم و مصیبت و نکبت ہماری جاگیریں

زہے تصوّرِ مایا، خوشا یہ حالِ زبوں
وہ خوابِ اہلِ سلف تھا یہ اس کی تعبیریں

یہاں بلائیں بھی بہروپ بھر کے آتی ہیں
یہ زہر خند نما رہبروں کی تقریریں

فسردہ سینے بھی لو دے اٹھے، دہکنے لگے
حریف دیکھ لے میری غزل کی تاثیریں

پیام صدیوں کے منسوخ ہونے والے ہیں
دہک رہی ہیں لبِ گرم پر وہ تقریریں

پیامِ خوابِ اجل ہیں یہ اہلِ زنداں کو
فراق نالہ، ناقوس ہو کہ تکبیریں

Scanned with CamScanner

شامِ عیادت

اگست ۱۹۴۳ء

سول اسپتال الہ آباد میں بسترِ علالت سے

(۱)

یہ کون مسکراہٹوں کا کارواں لئے ہوئے
شبابِ شعر و رنگ و نُور کا دھواں لئے ہوئے
دھواں کہ برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
چٹیلی زندگی کی شادمانیاں لئے ہوئے
لبوں سے پنکھڑی گلاب کی حیات مانگے ہے
کنول سی آنکھ سو نگاہِ مہرباں لئے ہوئے
قدم قدم پہ دے اٹھی ہے لَو زمینِ رہ گزر
ادا ادا میں بے شمار بجلیاں لئے ہوئے
نکلتے پھُیتے دنوں کی آہٹیں نگاہ میں
رسیلے ہونٹ فصلِ گل کی داستاں لئے ہوئے
خطوطِ رخ میں جلوۂ گر وفا کے نقش سر بسر
دلِ غنی میں کل ''حسابِ دستاں'' لئے ہوئے
وہ مسکراتی آنکھیں جن میں رقص کرتی ہے بَہار
شفق کی، گل کی، بجلیوں کی شوخیاں لئے ہوئے
ادائے حسن برق پاش، شعلہ زن، نظارہ سوز

Scanned with CamScanner

فضائے حسن اُودی اُودی بجلیاں لئے ہوئے
جگانے والے نغمۂ سر لبوں پہ موج زن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے
وہ نرگسِ سیاہ، نیم باز، میکدہ بدوش
ہزار مست راتوں کی جوانیاں لئے ہوئے
تغافل و خمار اور بے خودی کی اوٹ میں
نگاہیں اک جہاں کی ہوشیاریاں لئے ہوئے
ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے
زفرق تا قدم تمام چہرہ جسم نازنیں
لطیف جگمگاہٹوں کا کارواں لئے ہوئے
تبسم تکلمے، تکلمش ترنمے
نفس نفس میں تھرتھراتا سازِ جاں لئے ہوئے
جبینِ نور جس پہ پڑ رہی ہے نرم چھوٹ سی
خود اپنی جگمگاہٹوں کی کہکشاں لئے ہوئے
"ستارہ بارو مہ چکاں و خور فشاں" جمالِ یار
جہانِ نور کارواں بہ کارواں لئے ہوئے
وہ زلف خم بہ خم شمیم مست سے دھواں دھواں
وہ رخ چمن چمن بہارِ جاوداں لئے ہوئے
بہ مستئ جمال کائنات، خوابِ کائنات
بہ گردشِ نگاہ دُور آسماں لئے ہوئے

Scanned with CamScanner

یہ کون آ گیا مرے قریب عضو عضو میں
جوانیاں، جوانیوں کی آندھیاں لئے ہوئے
یہ کون آنکھ پڑ رہی ہے مجھ پر اتنے پیار سے
وہ بھولی سی وہ یاد سی کہانیاں لئے ہوئے
یہ کس کی مہکی مہکی سانسیں تازہ کر گئیں دماغ
شبوں کی راز، نورِ مہ کی نرمیاں لئے ہوئے
یہ کن نگاہوں نے مرے گلے میں باہیں ڈال دیں
جہان بھر کے دکھ سے درد سے اماں لئے ہوئے
نگاہِ یار دے گئی مجھے سکونِ بے کراں
وہ بے کہی وفاؤں کی گواہیاں لئے ہوئے
مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون
نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے
مری فسردہ اور بجھی ہوئی جبیں کو چھو لیا
یہ کس نگاہ کی کرن نے سازِ جاں لئے ہوئے
ستے سے چہرے پر حیات رسمسائی مسکرائی
نہ جانے کب کے آنسوؤں کی داستاں لئے ہوئے
تبسمِ سحر ہے اسپتال کی اداس شام
یہ کون آ گیا نشاطِ بے کراں لئے ہوئے
ترے نہ آنے تک اگر چہ مہرباں تھا اک جہاں
میں رو کے رہ گیا ہوں سو غمِ نہاں لئے ہوئے
زمین مسکرا اٹھی، یہ شام جگمگا اٹھی
بہار لہلہا اٹھی شمیمِ جاں لئے ہوئے

Scanned with CamScanner

فضائے اسپتال ہے کہ رنگ و بو کی کروٹیں
ترے جمال لالہ گوں کی داستاں لئے ہوئے
فراقؔ آج پچھلی رات کیوں نہ مر رہوں کہ اب
حیات ایسی شامیں ہوگی پھر کہاں لئے ہوئے

(۲)

مگر نہیں کچھ اور مصلحت تھی اس کے آنے میں
جمال و دید یار تھے نیا جہاں لئے ہوئے
اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے آدمی
جبیں پہ شاہکارِ دہر کا نشاں لئے ہوئے
اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے دیوتا
طہارتوں کا فرقِ پاک پر نشاں لئے ہوئے
خدائی آدمی کی ہوگی اس نئے جہان پر
ستاروں کے ہیں دل یہ پیش گوئیاں لئے ہوئے
سلگتے دل شرر فشاں و شعلہ بار، برق پاش
گزرتے دن حیاتِ نو کی سرخیاں لئے ہوئے
تمام قول اور قسم نگاہِ نازِ یار تھی
طلوعِ زندگیِ نو کی داستاں لئے ہوئے
نیا جنم ہوا مرا کہ زندگی نئی ملی
جیوں گا شام دید کی نشانیاں لئے ہوئے
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کے عہدِ نو کے پردہ داروں نے
گزر گیا زمانہ یادِ رفتگاں لئے ہوئے
ہم انقلابیوں نے یہ جہاں بچا لیا مگر
ابھی ہے اک جہاں وہ بدگمانیاں لئے ہوئے

Scanned with CamScanner

(۳)

نئے زمانے میں اگر اداس خود کو پاؤں گا
یہ شام یاد کر کے اپنے غم کو بھول جاؤں گا
عیادتِ حبیب سے وہ آج زندگی ملی
خوشی بھی چونک چونک اٹھی تو غم کی آنکھ کھل گئی
اگرچہ ڈاکٹر نے مجھ کو موت سے بچا لیا
پر اس کے بعد اس نگاہ نے مجھے جلا لیا
نگاہِ یار تجھ سے اپنی منزلیں میں پاؤں گا
تجھے جو بھول جاؤں گا تو راہ بھول جاؤں گا

(۴)

قریب تر میں ہو چلا ہوں دکھ کی کائنات سے
میں اجنبی نہیں رہا حیات سے ممات سے
وہ دکھ سہے کہ مجھ پہ کھل گیا ہے دردِ کائنات
ہے اپنے آنسوؤں سے مجھ پہ آئینہ غمِ حیات
یہ بے قصور جاندار درد جھیلتے ہوئے
یہ خاک و خوں کے پتلے اپنی جاں پہ کھیلتے ہوئے
وہ زیست کی کراہ جس سے بے قرار ہے فضا
وہ زندگی کی آہ جس سے کانپ اٹھتی ہے فضا
کفن ہے آنسوؤں کا دکھ کی ماری کائنات پر
حیات کیا، انہیں حقیقتوں سے ہونا بے خبر
جو آنکھ جاگتی رہی ہے آدمی کی موت پر
وہ ابرِ رنگ رنگ کو بھی دیکھتی ہے سادہ تر

Scanned with CamScanner

سکھا گیا ہے دکھ مرا پرائی پیر جاننا
نگاہِ یار تھی یہاں بھی آج میری رہنما
یہی نہیں کہ مجھ کو آج زندگی نئی ملی
حقیقتِ حیات مجھ پر سو طرح سے کھل گئی
گواہ ہے یہ شام اور نگاہِ یار ہے گواہ
خیال موت کو میں اپنے دل میں اب نہ دونگا راہ
جیوں گا ہاں جیوں گا اے نگاہِ آشنائے یار
سدا سہاگ زندگی ہے اور جہاں سدا بہار

(۵)

ابھی تو کتنے ناشنیدہ نغمۂ حیات ہیں
ابھی نہاں دلوں سے کتنے رازِ کائنات ہیں
ابھی تو زندگی کے ناچشیدہ رس ہیں سیکڑوں
ابھی تو ہاتھ میں ہم اہلِ غم کے جس ہیں سیکڑوں
ابھی وہ لے رہی ہیں میری شاعری میں کروٹیں
ابھی چمکنے والی ہیں چھپی ہوئی حقیقتیں
ابھی تو بحر و بر پہ سو رہی ہیں میری وہ صدائیں
سمیٹ لوں انہیں تو پھر وہ کائنات کو جگائیں
ابھی تو روح بن کے ذرے ذرے میں سماؤنگا
ابھی تو صبح بن کے میں افق پہ تھرتھراؤں گا
ابھی تو میری شاعری حقیقتیں لٹائے گی
ابھی مرے صدائے درد اک جہاں پہ چھائے گی
ابھی تو آدمی اسیر دام ہے غلام ہے
ابھی تو زندگی صد انقلاب کا پیام ہے

Scanned with CamScanner

ابھی تمام زخم و داغ ہے تمدّنِ جہاں
ابھی رخِ بشر پہ ہیں بہیمیت کی جھائیاں
ابھی مشیتوں پہ فتح پا نہیں سکا بشر
ابھی مقدروں کو بس میں لا نہیں سکا بشر
ابھی تو اس دکھی جہاں میں موت ہی کا دور ہے
ابھی تو جس کو زندگی کہیں وہ چیز اور ہے
ابھی تو خون تھوکتی ہے زندگی بہار میں
ابھی تو رونے کی صدا ہے نغمۂ ستار میں
ابھی تو اڑتی ہیں رخِ بہار پر ہوائیاں
ابھی تو دیدنی ہیں ہر چمن کی بے فضائیاں
ابھی فضائے دہر لے گی کروٹوں پہ کروٹیں
ابھی تو سوتی ہیں ہواؤں کی وہ سنسناہٹیں
کہ جن کو سنتے ہی حکومتوں کے رنگِ رخ اڑیں
چپیٹیں جن کی سرکشوں کی گردنیں مروڑ دیں
ابھی تو سینۂ بشر میں سوتے ہیں وہ زلزلے
کہ جن کے جاگتے ہی موت کا بھی دل دہل اٹھے
ابھی تو بطنِ غیب میں ہے اس سوال کا جواب
خدائے خیر و شر میں لا نہیں سکا جس کی تاب
ابھی تو گود میں ہیں دیوتاؤں کی وہ ماہ و سال
جو دیں گے بڑھ کے برقِ طور سے حیات کو جلال
ابھی رگِ جہاں میں زندگی مچلنے والی ہے
ابھی حیات کی نئی شراب ڈھلنے والی ہے

Scanned with CamScanner

ابھی چھری ستم کی ڈوب کر اچھلنے والی ہے
ابھی تو حسرت اک جہان کی نکلنے والی ہے
ابھی تو گھن گرج سنائی دے گی انقلاب کی
ابھی تو گوش بر صدا ہے بزم آفتاب کی
ابھی تو پونجی داد کو جہان سے مٹانا ہے
ابھی تو سامراجوں کو سزائے موت پانا ہے
ابھی تو دانت پیستی ہے موت شہریاروں کی
ابھی تو خوں اتر رہا ہے آنکھوں میں ستاروں کی
ابھی تو اشتراکیت کے جھنڈے گڑنے والے ہیں
ابھی تو جڑ سے کشت وخوں کے نظم اکھڑنے والے ہیں
ابھی کسانِ و کام کار راج ہونے والا ہے
ابھی بہت جہاں میں کام کاج ہونے والا ہے
مگر ابھی تو زندگی مصیبتوں کا نام ہے
ابھی تو نیند موت کی مرے لئے حرام ہے
یہ سب پیام اک نگاہ میں وہ آنکھ دے گئی
بیک نظر کہاں کہاں مجھے وہ آنکھ لے گی

....

Scanned with CamScanner

آدھی رات

(۱)

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گمشدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں، جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جمائیاں آئیں

(۲)

تمولیوں کی دوکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگار کا پیڑ
دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
یہ موجِ نُور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کِھلتا چلا جائے اک سفید کنول
سپاہِ رُوس ہیں اب کتنی دور برلن سے؟
جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو
چھلک رہی ہے خمِ غیب سے شرابِ وجود

Scanned with CamScanner

فضائے نیم شبی نرگسِ خمار آلود
کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

(۳)

یہ رس کی سیج، یہ سکمار یہ سکومل گات
نین، کمل کی جھپک، کام روپ کا جادو
یہ رسمسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں
فلک پہ بکھرے ہوئے چاند اور ستاروں کی
چمکتی انگلیوں سے چھڑ کے سازِ فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں، تم بھی جاگ اٹھو

(۴)

شعاعِ مہر نے یوں ان کو چوم چوم لیا
ندی کے بیچ کمدنی کے پھول کھل اٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی
حنا کی ٹٹیوں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنسناہٹ سی
لٹوں میں رات کی دیوی کی تھرتھراہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہوگی

(۵)

یہ محوِ خواب ہیں رنگین مچھلیاں تہِ آب
کہ حوض صحن میں اب ان کی چشمکیں بھی نہیں

Scanned with CamScanner

یہ سرنگوں ہیں سرِ شاخ پھول گرُہل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں
یہ چاندنی ہے کہ اُمڈا ہوا ہے رس ساگر
اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں

(۶)

قریب چاند کے منڈلا رہی ہے اک چڑیا
بھنور میں نور کے کروٹ سے جیسے ناؤ چلے
کہ جیسے سینۂ شاعر میں کوئی خواب پلے
وہ خواب سانچے میں جس کے نئی حیات ڈھلے
وہ خواب جس سے پرُانا نظامِ غم بدلے
کہاں سے آتی ہے مدمالتی لتا کی لپٹ
کہ جیسے سیکڑوں پریاں گلابیاں چھڑکائیں
کہ جیسے سیکڑوں بن دیویوں نے جھولے پر
ادائے خاص سے ایک ساتھ بال کھول دیئے
لگے ہیں کان ستاروں کے جس کی آہٹ
اس انقلاب کی کوئی خبر نہیں آتی
دلِ نجوم دھڑکتے ہیں کان بجتے ہیں

(۷)

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات، یہ شبِ ماہ
یہ پرسکوں یہ پراسرار یہ اداس سماں

Scanned with CamScanner

یہ نرم نرم ہواؤں کے نیلگوں جھونکے
فضا کی اُوٹ میں مردوں کی گنگناہٹ ہے
یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے
دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ
خنک دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ
ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن
حیات پردۂ شب میں بدلتی ہے پہلو
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا!
مرے خیال میں اب ایک بج رہا ہوگا!

(۸)

گلوں نے چادرِ شبنم سے منہ لپیٹ لیا
لبوں پر سوگئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ ترکی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوتِ نیم شبی ہے انہیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

(۹)

نئی زمین، نیا آسمان، نئی دنیا
نئے ستارے، نئی گردشیں، نئے دان رات

Scanned with CamScanner

زمیں سے تا بفلک انتظار کا عالم
فضائے زرد میں، دھندلے غبار کا عالم
حیاتِ موت نما انتشار کا عالم
ہے موجِ دود کہ دھندلی فضا کی نبضیں ہیں
تمام خستگی و ماندگی یہ دورِ حیات
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات
یہ سرد سرد یہ بے جان پھیکی پھیکی چمک
نظامِ ثانیہ کی موت کا پسینہ ہے
خود اپنے آپ میں یہ کائنات ڈوب گئی
خود اپنی کوکھ سے پھر جگمگا کے ابھرے گی
بدل کے کینچلی جس طرح ناگ لہرائے

(۱۰)

خنک فضاؤں میں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
کہ آبگینوں پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار
یہ موجِ غفلتِ معصوم یہ خمارِ بدن
یہ سانس نیند میں ڈوبی یہ آنکھ مدماتی
اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

....

Scanned with CamScanner

رُباعیات

موتی کی کان رس کا ساگر ہے بدن
درپن آکاش کا سراسر ہے بدن
انگڑائی میں راج ہنس تولے ہوئے پر
یا دودھ بھرا مان سرود رہے بدن

کھنچتا ہے عبث بغل میں باہوں کو تولے
کھو جانے کا ہے وقت تکلف نہ رہے
ہنگامِ وصال کر سنبھلنے کی نہ فکر
سو سو ہاتھوں سے میں سنبھالے ہوں تجھے

چڑھتی جمنا کا تیز ریلا ہے کہ زلف
بل کھایا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی لو
گھنشیام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

جوبن رس پتلیوں کے اندر ڈولے
اس نرمل جل میں روپ مریم دھولے
یہ نرم نظر کی سیج، پلکوں کی یہ چھاؤں
سوئی ہے سہاگ رات جوڑا کھولے

Scanned with CamScanner

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے تولے
جب شبنم نے فلک سے موتی رولے
کچھ سوچ کے خلوت میں بصد ناز اس نے
نرم انگلیوں سے بند قبا کے کھولے

آجا کہ کھڑی ہے شام پردا گھیرے
مدت ہوئی جب ہوئے تھے درشن تیرے
مغرب سے سنہری گرد اٹھی سوئے قاف
سورج نے اگنی رتھ کے گھوڑے پھیرے

سنگیت کی پنکھڑی کو شبنم دھو جائے
جیسے شعلوں کی جگمگاہٹ کھو جائے
پچھلے کو خمسار جسم رنگیں جیسے
کلیوں کے لبوں پہ مسکراہٹ سو جائے

مہکے ہوئے بن سے زلف کھاتی ہوئی میل
آنکھوں میں ہرن کے بچے کرتے ہیں کلیل
جیسے مری لے تاروں کو چھو لیتی ہے
پروان چڑھے تو یونہی اے پریم کی بیل

Scanned with CamScanner

کس درجہ سکوں نما ہیں ابروئے ہلال
خیر و برکت کے دھن لٹاتی ہوئی چال
جیون ساتھی کے آگے دیوی بن کر
آتی ہے سہاگنی سجائے ہوئے تھال

امرت وہ ہلاہل کو بنا دیتی ہے
غصّے کی نظر پھول کھلا دیتی ہے
ماں لاڈلی اولاد کو تاڑے جیسے
کس پیار سے پریمی کو سزا دیتی ہے

زلف پرخم عنانِ شب موڑتی ہے
آوازِ طلسم تیرگی توڑتی ہے
یوں جلووں سے تیرے جگمگاتی ہے زمیں
ناگن جس طرح کینچلی چھوڑتی ہے

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

Scanned with CamScanner

آئے دم صبح، رسمساؤ اے دوست
جب دن ڈوبے تو گھر نہ جاؤ اے دوست
دن بھر تو رہے ہو پھول بن کر مرے پاس
اب بن کے چراغ جگمگاؤ اے دوست

یہ بزمِ خیال، چوڑیاں بجتی ہیں
بھیگی راتیں اداسیاں تجتی ہیں
دریا مکھڑوں کے اُمڈے آتے ہیں فراق
آئینۂ دل میں صورتیں بجتی ہیں

ہر شے پر تیرگی وہ چھاؤں گھنی
میخانۂ شب میں نوش و پیمانہ زنی
چھلکی چھلکی صبوحیٔ موج نسیم
فطرت کی وہ پچھلی رات اعضا شکنی

تنہائی میں ہم کسے بلائیں اے دوست
تم دور ہو کس کے پاس جائیں اے دوست
اس دولتِ وقت سے تو دم گھٹتا ہے
یہ نقد شب کہاں بھنائیں اے دوست

Scanned with CamScanner

جاگ اٹھے گی روح تم تو سو جاؤ گے
سر چشمۂ زندگی میں دھو جاؤ گے
کھو جاؤ گے جب مناظرِ فطرت میں
اپنے سے بہت قریب ہوجاؤ گے

اے معنئ کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفاتِ و ذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملائے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

ہنگامۂ روزگار دم لیتے ہیں
سنسار کا ہم بھید بھرم لیتے ہیں
یہ لمحے وہ ہیں جب دلِ شاعر میں فراقؔ
کچھ رمز و کنایات جنم لیتے ہیں

ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دُھن پیدا
ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گُن پیدا
میزانِ نشاط و غم میں صدیوں تُل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

Scanned with CamScanner

قبل اس کے کہ ہو فیصلۂ خیر و شر
جینے کا ثبوت دے زمانے کو بشر
بے حس کردارِ نیک سے موت بھلی
نامرد اخلاق سے جرائم بہتر

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراقؔ
تہذیبیں کیوں غروب ہوجاتی ہیں

کچھ نظریے ہیں ہر تمدن کی بنا
تاریخ تصادم انہیں آدرشوں کا
تہذیبوں کو اپنے سے ہے خطرہ یعنی
ہے نقصِ فکریات پیغامِ قضا

دُنیا ہے فسانہ بحدیثِ دگراں
کہتے جسے آرہے ہیں عنواں عنواں
دنیا کس کی غلط بیانی ہے فراقؔ
ہر جھوٹ میں جس کے صد حقائق پنہاں

Scanned with CamScanner

گو بزمِ سخن میں آپ لائے تشریف
خوش ہوں گے سن کے قافیہ اور ردیف
اس کا کیا کیجئے گا اے حاکمِ وقت
احساسِ لطیف سے جو ہوگی تکلیف

الفاظ کے پردوں میں کرو اس کا یقین
لیتی ہے سانس نظم شاعر کی زمیں
آہستہ ہی گنگناؤ میرے اشعار
ڈر ہے نہ مرے خواب کچل جائیں کہیں

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں
اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے
اک شخص کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

جلوہ دہِ خلدے کا مینا بازار
ہیں علم کی منڈیوں میں بھی کچھ جھک مار
دوکانِ شراب اٹھتی تھی ٹھیکے پر
دوکانِ ادب کے بھی ہیں کچھ ٹھیکے دار

Scanned with CamScanner

یہ بزمِ طرب، یہ مے گساری ساقی!
ہوتی چلی بے خودی سی طاری ساقی!
انگور کی پتیاں، خبر بھی ہے تجھے
اب ہو چلیں ابروؤں پر بھاری ساقی!

سورج نے دن کی باگ پھیری ساقی!
مینا سے نکال، کر نہ دیری ساقی!
ساغر میں ہیں خیرہ کن گناہوں کی لَویں
اب رات نہیں رہی اندھیری ساقی!

ساغر نے نئی جوت جگائی ساقی!
انگڑائی سی موجِ مے کو آئی ساقی!
محفل میں ستارہ بار و مہ و مہر چکاں
شاخِ ظلمات لہلہائی ساقی!

واعظ اپنی سی ہانکتے ہیں ساقی!
تقریروں کی خاک پھانکتے ہیں ساقی!
اٹھتے ہیں جو بلبلے مئے ساغر سے
کونین ان میں سے جھانکتے ہیں ساقی!

Scanned with CamScanner

اٹھتی ہوئی موجِ آتش تر ساقی!
باطل کیلئے ہے تیز خنجر ساقی!
یہ معجزۂ کشید صہبائے لطیف
کھنچ آئے حقیقتوں کے جوہر ساقی!

دارو کی دھار کا یہ سرگم ساقی!
یہ کن فیکوں کا سازِ پیہم ساقی!
خلاقانہ عمل ہے قلقل کی صدا
تخلیق جہانِ نو دما دم ساقی!

ہے نُور علیٰ نُور یہ منظر ساقی!
ساغر میں ہے عرق کہ جوہر ساقی!
موج اندر موج، شعلہ اندر شعلہ
خود جلوہ ہے خود حجابِ اکبر ساقی!

یہ پینے پلانے کا قرینہ ساقی!
روشن ہر دل کا آبگینہ ساقی!
جلتے ہیں چراغ موجِ بادہ سے چراغ
پاتا ہے فروغ علم سینہ ساقی!

Scanned with CamScanner

متفرقات

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل — مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں

بہار جل کے خزاں ہو خزاں لہک کے بہار — چمن میں اِسے شگوفے بھی چھوڑ سکتا ہوں

رفتہ رفتہ عشقِ مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

جہاں کو دیگی محبت کی تیغ آبِ حیات — ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

اہل غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی — لیکن ایثارِ محبت جان دے دینا نہیں

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

صبح ازل کو یونہی ذرا لڑ گئی تھی آنکھ — وہ آج تک نگاہ چرائے ہوئے سے ہیں

وہ سربسر نہاں و زسر تا قدم حجاب — پھر بھی ہر اک نظر میں سمائے ہوئے سے ہیں

لہو میں جوش ہو دل میں تڑپ ہو سر میں سودا ہو — جوانی وہ کہ جو آئے بلائے ناگہاں ہو کر

چمکتے درد، کھلے چہرے، مسکراتے اشک — سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات

غرض کہ کاٹ دے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہو یا ترے بُھلانے میں

Scanned with CamScanner

میں شادگام دید بھی محروم دید بھی ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں

نہ سمجھنے کی ہیں باتیں نہ یہ سمجھانے کی زندگی اُجتی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

کبھی سازِ طرب سن کر بھی نظریں بھیگ جاتی ہیں تو پھر اے شاعرِ فطرت الم کی داستاں کیوں ہو

محشر میں ساتھ میرا اب چھوڑتے نہیں ہیں اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

شبِ وصال کہ بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

زیادہ ظرف سے دنیا بھی کوئی دنیا ہے ہر اک نے تیری محبت کا جام چھلکایا

یہ زندگی کے کڑھے کوس یاد آتا ہے تیری نگاہِ کرم، کا گھنا گھنا سایہ

ذرہ ذرہ میں بارہا اے دوست تیری تصویر ہی نظر آئی

صباحتِ رُخِ رنگین بہارِ صبح وطن کھیلا ہوا ہے تیری مسکراہٹوں کا چمن

پوچھ نہ عشق کی نگاہ کیسی پڑی کہاں پڑی عقل اُلجھ کے رہ گئی دامِ تعینات میں

جہاں کہ جستجوِ یار میں ٹھہر جاتے یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

Scanned with CamScanner

اہلِ جنوں کی وسعتیں کچھ اور بڑھ گئیں	دل بڑھ گیا ہے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

جہاں فیصلہ نہ یہ کرسکیں کہ قدم کو روکیں کہ بڑھ چلیں	وہیں بستے ہیں تیرے غمزدہ، وہیں غمزدوں کا دیار ہے

دکھتے دل سے نغمۂ سازِ محبت چھیڑ دے	آپ رک جائینگی بحثیں کافر و دیندار کی

فضائل لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جس میں	فرشتہ ہو خدا ہو کچھ بھی ہو انساں نہیں ہوتا

بُھول جاتے ہوں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں	یاد کرتے ہوں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں	اور ہم بُھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں	لیکن اس ترکِ محبت کا ٹھکانہ بھی نہیں

یوں بھی مشکل ہے کچھ سکوں ملنا	عشق کی مصلحت سے دور بھی ہے

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی	کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست	خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

لے کہ جب ناز سے انگڑائی وہ بستر سے اُٹھا	فتنۂ صبح قیامت بھی برابر سے اُٹھا

Scanned with CamScanner

فراق دوڑ گئی رُوح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں

اس نرم نگاہی سے چمک اُٹھتا ہے اے دوست
وہ درد جو انسان کو بنا دیتا ہے انساں

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کی مانند تھراتھرائے جا

اپنی تسلیم و رضا پر شرم سی آنے لگی
ہم نیازِ عشق کی حد سے بھی بڑھ جائینگے کیا

یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب
تم دل دکھا دو وقتِ مصیبت تو بات ہے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

تو جو چاہے تو غمِ ہجر بھی آساں ہو جائے
تو نہ چاہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں

Scanned with CamScanner

کچھ صاحبِ کتاب کے بارے میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادبی زندگی کا سفر حقیقتاً ان کی تخلیقات سے بحیثیت شاعر شروع ہوتا ہے۔ شعر تو وہ ابتدائی مدرسے کے زمانے ہی سے کہنے لگے تھے، مڈل اسکول میں باقاعدہ طرحی اور غیر طرحی مشاعروں کی بناء ڈال دی تھی، خود بھی شعر کہتے اور دوسروں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور موجودہ مسلم انٹر کالج، میں جب تک رہے اپنی شاعری اور فی البدیہہ تقریروں کی وجہ سے مشہور رہے۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی درمیانی دہائی میں ان کی بعض نظمیں اور غزلیں دہلی کے مشہور اخبار ''وحدت'' اور ''الامان'' میں شائع ہوئیں تھیں۔

قیام فتح پور کے زمانے کی شاعری کے بہت سے نمونے ڈاکٹر صاحب کے چچا زاد بھائی سید ذاکر علی مقیم سینٹ لوئس (امریکہ) اور لڑکپن کے دوست شباہت علی خاں، مقیم جرمنی کے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ نثر کی طرف وہ، دراصل پاکستان آنے کے بعد متوجہ ہوئے لیکن ابتدائی کئی برسوں تک وہ شاعری کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے رہے اور مشاعروں سے گہری دلچسپی لیتے رہے، چنانچہ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ایک بے مثال یادگار مشاعرہ منعقد کرایا۔ اس مشاعرے کی صدارت علامہ نیاز فتح پوری نے کی اور جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، شعری بھوپالی، جگر مراد آبادی، اثر لکھنوی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش جیسے بڑے شاعر اس میں شریک ہوئے۔

تحقیق کے حوالے سے ان کا پہلا قابلِ قدر مضمون اکتوبر ۱۹۵۱ء کے نگار (لکھنو) میں ''زبان اور رسم الخط'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ پہلا تنقیدی مضمون بھی بہ عنوان ''کلام غالب میں استفہام'' نگار (لکھنو) ہی میں اکتوبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں چھپا۔ یہ دونوں مضامین ایسے مقبول ہوئے اور بزرگ ادیبوں نے ان کی اتنی داد دی کہ ڈاکٹر صاحب پوری طرح نثر کی طرف متوجہ ہو گئے اور شاعری کو ثانوی حیثیت دے دی بلکہ نظر انداز کر دیا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان، ان کے بیشتر مقالات ''ادب لطیف (لاہور)'' نگار (لکھنو) اور ''صحیفہ'' (لاہور) میں چھپے، پھر ان کا نام ہر معتبر رسالے میں نظر آنے لگا اوّلین تصانیف ''اُردو رُباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء'' اور ''تدریس اُردو'' پہلے پہل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئیں پھر کتابوں اور مقالوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ غرض کہ ان کی تخلیقی اور علمی و ادبی

Scanned with CamScanner

زندگی ایک بھرپور پس منظر رکھتی ہے اس کی روشنی میں ان کا مختصر سوانحی خاکہ اس طور پر بنتا ہے۔

نام، وطن اور تاریخِ ولادت:

نام	:	سید دلدار علی
قلمی نام	:	فرمان فتح پوری
تاریخِ ولادت	:	۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء
جائے ولادت	:	فتح پور (ہسوہ) یو پی ہندوستان
والد کا نام	:	سید عاشق علی (متوفی ۱۹۳۳ء) بن سید عمر علی
والدہ کا نام	:	سیدہ عزیز النساء بنت حافظ سید مقصود علی
قومیت ووطنیت	:	پاکستانی

قومی اعزاز:

ستارۂ امتیاز (۱۹۸۵ء)

موجودہ پتہ:

سی-۲۸-۱۳-ڈی گلشن اقبال کراچی

ٹیلی فون نمبر: ۴۹۸۰۴۴۰

موجودہ منصب ومشغلہ:

☆ چیئرمین اُردو ڈکشنری بورڈ وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان

☆ مدیر اعلیٰ ماہنامہ نگار پاکستان کراچی

سابقہ مشاغل ومناصب:

☆ ۱۹۴۶ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے فوراً بعد مدرسہ اسلامیہ (مسلم ہائی اسکول فتح پور) میں انگریزی اور ریاضی کی ٹیچر ہو گئے۔

☆ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء آڈٹ ڈپارٹمنٹ کے تحت بحیثیت ڈویژنل اکاؤنٹنٹ

Scanned with CamScanner

اے جی پی آر سے وابستہ رہے۔

☆ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء سرشتۂ تعلیم کراچی کے تحت گورنمنٹ ہائی اسکول کوتوال بلڈنگ میں ریاضی اور انگریزی کے معلم رہے۔

☆ اگست ۱۹۸۵ء میں شعبہ اردو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر وصدر شعبہ کے منصب تک پہونچے۔

☆ ۱۹۸۵ء میں وفاقی حکومت نے اُردو ڈکشنری بورڈ کے لئے ان کی خدمات مستعار لے لیں چنانچہ وہ ایک سال بیک وقت، شعبہ جامعہ کراچی اور اُردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ رہے۔

☆ مئی ۱۹۸۵ء سے تقریباً دس سال، اُردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے چیف ایڈیٹر اور سیکریٹری کی حیثیت میں وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ رہے اور الف سے لے کر لام تک کے الفاظ پر مشتمل ہزار، ہزار صفحات کی سولہ جلدیں ان کے دورِ ادارت میں شائع ہوگئیں۔

☆ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب سندھ پبلک سروس کمیشن سے منسلک ہوگئے وہاں سے سبکدوش ہوئے تو اُردو ڈکشنری بورڈ کے چیئر مین بنا دیئے گئے۔

اعزازی خدمات:

☆ اُردو آرٹس کالج کراچی کے شعبہ شرقی سے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء منسلک رہے۔ ڈاکٹر غلام سرور، پروفیسر سید عبدالرشید احمد فاضل، پروفیسر عبدالعزیز اور ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں۔

☆ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۲ء تقریباً پندرہ سال جامعہ ملّیہ ملیر سے اعزازی طور پر منسلک رہے اور ڈاکٹر محمود حسین کی ایماء پر ٹیچرس ٹریننگ کالج میں لیکچر دیئے۔

☆ ملیر سٹی میں ماڈل نائٹ اسکول قائم کیا اور ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۵ء پندرہ سال بالغان کی تعلیم سے دلچسپی لی۔

Scanned with CamScanner

تعلیمی کوائف و اسناد

ابتدائی تعلیم:

۱۔ ناظرہ قرآن اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مثل مصدر نامہ، گلستاں، بوستاں، دستور الصبیان اور کریما و ماقیماں وغیرہ گھر پر والد صاحب اور چچا چچی سے پڑھیں۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کیلئے والد کی وفات کے بعد ۱۹۳۳ء میں سرکاری ابتدائی مدرسے میں داخل ہوئے اور بتدریج تعلیم کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔

رسمی تعلیم:

۱۔ ورنا کیولر مڈل:

۱۹۴۱ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا فتح پور ڈسٹرکٹ میں اوّل آئے اور وظیفہ حاصل کیا۔

(۲) ہائی اسکول:

۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور کی انگریزی شاخ مسلم ہائی اسکول سے درجہ اوّل میں الٰہ آباد بورڈ سے پاس کیا اور دو مضامین میں امتیاز حاصل کر کے یوپی میں ساتویں پوزیشن کے ساتھ سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔

(۳) ایف اے:

۱۹۴۸ء میں الٰہ آباد بورڈ، یوپی سے سیکنڈ ڈویژن میں ایف اے کیا۔

(۴) بی اے:

۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کیا۔

Scanned with CamScanner

(۵) ایل ایل۔بی:

۱۹۵۳ء میں ایس ایم لاء کالج کراچی سے سیکنڈ ڈویژن میں ایل ایل۔بی کیا۔

(۶) بی۔ٹی:

۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج کراچی سے سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔

(۷) ایم اے:

۱۹۵۸ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا۔

(۸) پی ایچ ڈی:

۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے اُردو کی منظوم داستانوں پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی مقالہ انجمنِ ترقی اُردو کراچی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

(۹) ڈی لٹ:

۱۹۷۴ء میں ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' نامی کتاب پر کراچی یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی یہ کتاب پہلے ۱۹۷۲ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے چھپی بعد ازاں ۱۹۹۸ء میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کی۔تیسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آنے والا ہے۔

غیر رسمی تعلیم:

۱۔فتح پور کے قیام میں مدرسہ اسلامیہ کے مولوی محمد اسحٰق اور مولوی سید عبدالوحید سے دو سال نجی طور پر عربی و فارسی پڑھی۔

۲۔آبائی گاؤں کے پنڈت مہابیر پرشاد سے ہندی زبان و ادب کے ساتھ تلسی داس کی رامائن کا خصوصی درس لیا۔

Scanned with CamScanner

تالیفی و تصنیفی سرمایہ:

۱۔ مطبوعہ کتابیں:

فرمان صاحب کی ان کتابوں میں سے بیشتر کے متعدد ایڈیشن پاکستان اور بھارت سے نکل چکے ہیں۔ ذیل میں ہر کتاب کے سامنے مقامات اشاعت کے ساتھ صرف اس کی اوّلین اشاعت کا سال درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اُردو رُباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء	کراچی/ لاہور ۱۹۶۲ء
۲۔ تحقیق و تنقید	کراچی/ دہلی ۱۹۶۳ء
۳۔ تدریس اُردو	کراچی/ اسلام آباد ۱۹۶۲ء
۴۔ غالب شاعر امروز و فردا	لاہور ۱۹۷۰ء
۵۔ اُردو کی منظوم داستانیں	کراچی ۱۹۷۰
۶۔ نواب مرزا شوق کی مثنویاں	لاہور ۱۹۷۲ء
۷۔ دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ	لاہور ۱۹۷۲ء
۸۔ اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	لاہور/ کراچی ۱۹۷۲ء
۹۔ زبان اور اُردو زبان	کراچی/ لاہور ۱۹۷۴ء
۱۰۔ اُردو کی نعتیہ شاعری	لاہور/ کراچی ۱۹۷۴ء
۱۱۔ نیا اور پرانا ادب	کراچی ۱۹۷۴ء
۱۲۔ قمر زمانی بیگم	لاہور/ کراچی ۱۹۷۲ء
۱۳۔ ارمغان گوکل پرشاد	کراچی ۱۹۷۵ء
۱۴۔ میر انیس حیات اور شاعری	لاہور/ کراچی ۱۹۷۶ء
۱۵۔ ہندی اُردو تنازع	کراچی ۱۹۷۶ء

Scanned with CamScanner

۱۶۔ اُردو املا اور رسم الخط	کراچی/ لاہور ۱۹۷۷ء
۱۷۔ اقبال سب کیلئے	کراچی/ دہلی ۱۹۷۷ء
۱۸۔ اُردو افسانہ اور افسانہ نگار	کراچی/ دہلی ۱۹۸۲ء
۱۹۔ دید و باز دید (سفرنامہ ہند)	ملتان ۱۹۸۳ء
۲۰۔ فنِ تاریخ گوئی اور اس کی روایت	کراچی/ لاہور ۱۹۸۴ء
۲۱۔ تاویل و تعبیر	لاہور ۱۹۸۴ء
۲۲۔ نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	کراچی ۱۹۸۶ء
۲۳۔ اردو کی ظریفانہ شاعری	لاہور/ دہلی ۱۹۸۷ء
۲۴۔ اُردو کا افسانوی ادب	ملتان، دہلی ۱۹۸۸
۲۵۔ نیاز فتح پوری دیدہ و شنیدہ	لاہور ۱۹۸۹ء
۲۶۔ اُردو املا اور قواعد	اسلام آباد ۱۹۹۰ء
۲۷۔ اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	کراچی ۱۹۹۰ء
۲۸۔ اردو کی بہتر مثنویاں	لاہور ۱۹۹۳ء
۲۹۔ ادبیات و شخصیات	لاہور ۱۹۹۳ء
۳۰۔ قائداعظم اور تحریکِ پاکستان	لاہور ۱۹۷۶ء
۳۱۔ خطباتِ محمود	لاہور ۱۹۸۳ء
۳۲۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء	کراچی، دہلی، لاہور ۱۹۸۹ء ۹۷ء
۳۳۔ اُردو شاعری کا فنی ارتقاء	کراچی، دہلی، لاہور ۱۹۹۰ء ۹۷ء
۳۴۔ مولانا جوہر، حیات اور کارنامے	کراچی، لاہور ۱۹۶۹ء
۳۵۔ مولانا حسرت موہانی، شخصیت اور فن	لاہور ۱۹۷۷ء

Scanned with CamScanner

۳۶۔قومی یکجہتی، اُردو اور پاکستان	کراچی۱۹۹۲ء
۳۷۔سری پرکاش اور پاکستان	لاہور۱۹۹۳ء
۳۸۔ڈاکٹر محمود حسین، شخصیت اور کارنامے	لاہور۱۹۷۶ء
۳۹۔غزل اُردو کی شعری روایت	کراچی۱۹۹۵ء
۴۰۔ادب اور ادب کی افادیت	کراچی۱۹۹۶ء
۴۱۔ادا جعفری شخصیت اور فن	کراچی۱۹۹۸ء
۴۲۔تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	کراچی۱۹۹۸ء
۴۳۔میر کو سمجھنے کیلئے	کراچی۱۹۹۹ء

44- Sir Syed Ahmed Khan on the Present State of Indian Politics 1982 Lahore.

45- Pakistan Movement and Hindi-Urdu Conflict Lahore-1986

۴۶۔ادب اور ادبیات	مکتبہ عالیہ لاہور ۲۰۰۱ء
۴۷۔عملی تنقیدیں	مکتبہ عالیہ اُردو بازار لاہور ۲۰۰۱ء
۴۸۔تعبیراتِ غالب	ادارۂ یادگار غالب کراچی ۲۰۰۲ء
۴۹۔شرح و متن غزلیاتِ غالب	بیکن بکس ملتان ۲۰۰۰ء
۵۰۔مشاہیرِ فتح پور (ہسوہ)	بیکن بکس ملتان ۲۰۰۲ء
۵۱۔تنقیدی شذرات و مقالات	الوقار پبلی کیشنز۔لاہور ۲۰۰۵ء
۵۲۔نصف الملاقات	الوقار پبلی کیشنز۔لاہور زیرِ طبع
۵۳۔جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری	الوقار پبلی کیشنز۔لاہور زیرِ طبع

مقالات:

کم و بیش پانچ سو تنقیدی مقالات اُردو کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

Scanned with CamScanner

تبصرے:

تقریباً چھ سو کتابوں پر تبصرے لکھے۔ یہ مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ طویل تبصرے ''باب الانتقاد'' کے نام سے ماہنامہ نگار میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ان تبصروں کو تنقیدی مضامین کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تبصروں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

اداریے:

۱۹۶۶ء سے ہر مہینے ''ملاحظات'' کے عنوان سے ماہنامہ ''نگار'' پاکستان کے اداریے لکھ رہے ہیں جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہو چکی ہے۔

دیباچے اور مقدمات:

دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تقریباً ۱۰۰ کتابوں پر دیباچے اور مقدمات لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض مقدمات بلند پایہ تحقیقی و تنقیدی مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ریاض صدیقی، پروفیسر نجیب جمال اور محمد اصغر کاظمی انہیں مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ دو جلدیں تنقید نما کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

مکتوبات:

مختلف ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت کا سلسلہ تقریباً ساٹھ سال سے قائم ہے۔ ان خطوط میں بھی علمی اور ادبی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور بعض حضرات کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں یہ خط محفوظ ہیں اور وہ انہیں شائع بھی کرنا چاہتے ہیں۔

مذاکرے اور کانفرنسیں:

ٹی اور ریڈیو پر گفتگو کے علاوہ قومی و بین الاقوامی سطح کے درجنوں مذاکروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ مقالے پڑھے صدارت کی ان جلسوں کی تقریریں اور خطبات بھی بڑی

Scanned with CamScanner

تعداد میں محفوظ ہیں اور کتابی صورت میں شائع کرنے کے لائق ہیں۔

سلسلہ نیاز و نگار:

''نگار'' ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔ آگرہ اور بھوپال ہوتے ہوئے ۱۹۲۷ء میں علامہ نیاز کے ساتھ لکھنو منتقل ہوگیا۔ جنوری ۱۹۶۲ء سے ڈاکٹر فرمان پوری صاحب کی ادارت میں کراچی سے شائع ہونے لگا۔ بعد میں لکھنو سے بند ہوگیا۔ کراچی سے یہ علمی و ادبی ماہنامہ پابندی وقت کے ساتھ پچھلے ۴۳ برسوں سے تاحال جاری ہے، اور اس کے ہر سال خصوصی شمارے اور سالنامے ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں نکلتے رہتے ہیں۔

تعلیمی اور علمی و ادبی ادارے، جن سے وابستہ رہے یا ہیں:

۱۔ ۱۹۵۸ء سے تقریباً تیس سال جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو سے وابستگی۔

۲۔ ۱۹۶۲ء سے ماہنامہ ''نگارِ پاکستان'' کے مدیر اعلیٰ۔

۳۔ پاکستان کی بیشتر جامعات کی مختلف تحقیقی اور تعلیمی کمیٹیوں کے رکن۔

۴۔ ملک کے مختلف ٹیکسٹ بورڈز کی رہنما کمیٹیوں کے رکن اور کتابوں کے مسودوں کے مرتبین و مبصرین کے کنویز۔

۵۔ سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ بورڈوں کی اکیڈمک کمیٹیوں کے رکن۔

۶۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی ''پبلی کیشن کمیٹی'' کے رکن۔

۷۔ مقتدرہ قومی زبان کی املا کمیٹی کے صدر۔

۸۔ پاکستان کی بیشتر جامعات کے پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرز کے نگران اور ممتحن۔

۹۔ پاکستان کے قومی کتب خانوں کیلئے مخطوطات کی خریداری کمیٹی کے رکن۔

۱۰۔ قومی سطح کے انعامات و اعزازت دینے والی ایوارڈ کمیٹی کے رکن۔

۱۱۔ مجلسِ جامعہ تعلیم ملی کی انتظامی کمیٹی کے رکن اور نائب صدر۔

۱۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن۔

Scanned with CamScanner

۱۳۔ ادارہ یادگارِ غالب کراچی کے رکن اور نائب صدر۔

۱۴۔ اُردو سائنس بورڈ لاہور کے ہیئت حاکمہ کے رکن۔

۱۵۔ علامہ اقبال اکیڈمی لاہور کی ہیئت حاکمہ کے رکن۔

۱۶۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے بورڈ آف گورنرز اور مجلس انتظامیہ کے رکن۔

۱۷۔ مزار قائد اعظم کتبہ کمیٹی کے رکن۔

۱۸۔ فنی اصطلاحات کے تراجم کی نگرانی اور معیار مقرر کرنے والی قومی کمیٹی کے رکن۔

۱۹۔ فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے معتمد عمومی اور رکن۔

۲۰۔ تقریباً پندرہ سال اُردو لغت بورڈ کے مدیر اعلیٰ، سیکریٹری اور صدر۔

ممالک جن کی سیاحت کی:

امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس، سعودی عرب، چین، مسقط، خلیج فارس، بھارت۔

اعزازت و اعترافات:

۱۔ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے ۱۹۸۵ء میں غیر معمولی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ''ستارۂ امتیاز'' ملا۔

۲۔ پاکستانی جامعات کے پہلے پروفیسر ہیں جو اُردو زبان و ادب سے متعلق بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں رکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

۳۔ کراچی یونیورسٹی کی سینڈیکیٹ نے پانچ بار نقد انعامات کی صورت میں تحقیقی کاموں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

۴۔ دو بار رائٹرز گلڈ آف پاکستان کی طرف سے داؤد ادبی ایوارڈ کے مستحق قرار پائے ہیں۔

۵۔ ایک درجن سے زائد ریسرچ اسکالران کی نگرانی میں تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے چکے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۶۔ مختلف جامعات کے متعدد ریسرچ اسکالر آج بھی ان کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

۷۔ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر حکومتِ پاکستان نے علامہ اقبال پر ایک ایسی مستند اور جامع کتاب لکھنے پر مامور کیا جس میں علامہ کی زندگی اور فکر وفن کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔ سات سو صفحات کی یہ کتاب ''اقبال سب کیلئے'' کے نام سے حکومتِ پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی۔ اس کے متعدد ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ ہندوستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۸۔ ۱۹۷۶ء قائداعظم کے صد سالہ ولادت کے موقع پر بھی حکومتِ پاکستان نے موضوع دے کر ایک کتاب لکھوائی جو ''ہندی اُردو تنازع'' کے عنوان سے چھ سو صفحات میں انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ کئی بار چھپی اور زبان کے حوالے سے تحریکِ پاکستان کے بارے میں ایک اہم اور مستند ماخذ قرار پائی۔

۹۔ اُردو زبان وادب میں بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی۔ لٹ کی اسناد رکھنے کے سبب کراچی یونیورسٹی کے چانسلر اور گورنر سندھ نے طلائی تمغہ عطا کیا۔

۱۰۔ معروف فلاحی ادارے ''تنظیم برادارنِ پاکستان'' کی جانب سے ۱۹۸۷ء کا ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۱۱۔ ۱۹۸۸ء میں کراچی کے شہروں کی طرف سے وی آئی پی ادبی ایوارڈ کے ذریعے ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

۱۲۔ ۱۹۸۹ء میں ''یونی کیرین'' یونیورسٹی آف کراچی کی جانب سے نشانِ فضیلت کی سند دی گئی۔

۱۳۔ ۱۹۹۰ء جشن فیض کمیٹی کی طرف سے ''فیض احمد فیض'' ایوارڈ دیا گیا۔

۱۴۔ ۱۹۹۱ء میں ''فرسٹ کراچی سٹیزن ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

۱۵۔ ۱۹۹۲ء میں ''نشانِ سپاس'' کے عنوان سے ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے خدمات کا اعتراف کیا۔

۱۶۔ ۱۹۹۳ء میں برصغیر میں نعت گوئی پر پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ''نعت اکیڈمی ایوارڈ'' دیا گیا۔

۱۷۔ ۱۹۹۴ء میں کینیڈین اکیڈمی آف اُردو لٹریچر کی جانب سے ٹورنٹو میں ''انٹرنیشنل اُردو ایوارڈ'' دینے کا اعلان ہوااوراسی سال امریکہ وکینیڈا میں ''جشنِ فرمان'' کا اہتمام کیا گیا، اس جشن کے اجلاس نیویارک، واشنگٹن، سنٹ لوئس، اور لینڈو، شکاگو، نیوجرسی، ٹورنٹو وغیرہ میں منعقد ہوئے اوراس میں امریکہ وکینیڈا کے علاوہ برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کے متعدد اسکالروں مثلاً امراؤ طارق، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ساقی فاروقی اور ڈاکٹر آغا سہیل وغیرہ نے شرکت کی، اُردو کے معتبر اہلِ قلم نے مقالے لکھے جنہیں چار چار سوصفحات کی تین جلدوں میں قرینے سے مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ یہ کام امراؤ طارق صاحب نے کیا۔

۱۸۔ ۱۹۹۴ء تا ۲۰۰۱ء سندھ پبلک کمیشن کے رکن رہے۔

۱۹۔ ان دنوں اُردو ڈکشنری بورڈ کے چیئرمین ہیں۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner